اقبالؒ کے عرفانی زاویے

مجموعۂ مضامین

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

اقبالؒ کے عرفانی زاویے

اقبالؒ کے عرفانی زاویے

مجموعۂ مضامین

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

القمر انٹرپرائزز
غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور

خوبصورت، معیاری کتابیں

القمر انٹرپرائزز
اہتمام: محمد سعید اللہ صدیقی

جملہ حقوق حق مصنف محفوظ

طبع : اول 2001ء
مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
قیمت پاکستان میں : 180 روپے
غیر ممالک میں : 10 امریکی ڈالر

اِنتساب

والد گرامی

جنت مکانی خلد آشیانی مرحوم و مغفور

سید سبط نبی عابدی منصفؔ (ریٹائیرڈ جج)

کی محبتوں کے نام جو میرے لئے اقبالؔ شناسی

کے پہلے اور آخری معلم تھے۔

دانم نرسد ذرّہ بہ خورشید و لیکن

شوق طیراں می کشد ارباب ہمم را

(عرفیؔ شیرازی)

فہرست

(۱) علامہ اقبالؔ کی دعا	3
(۲) اقبالؔ مفسرِ قرآن (سورۂ اخلاص کی تفسیر)	7
(۳) علامہ اقبالؔ کی نعتیہ شاعری	15
(۴) علامہ اقبالؔ فنافی الرسولؐ تھے	21
(۵) علامہ اقبالؔ اور زیارتِ رسولؐ	26
(۶) بوصیری اور اقبالؔ (قصیدہ بردہ شریف)	29
(۷) اقبالؔ اور عشقِ حضرت علیؑ	33
(۸) اقبالؔ عاشقِ امام حسینؑ	39
(۹) منقبتِ حضرت فاطمہؑ ۔ (اقبالؔ کی قلبی واردات)	43
(۱۰) اقبالؔ کا تصورِ زمان و مکان	48
(۱۱) علامہ اقبالؔ کا شاہین	53
(۱۲) علامہ اقبالؔ کا ابتدائی کلام	63
(۱۳) علامہ اقبالؔ اور حسن نظامی کی قلمی جنگ	67
(۱۴) علامہ اقبالؔ اور اکبر الہ آبادی	74
(۱۵) علامہ اقبالؔ اور مہاراجہ کشن پرشادؔ	80

(۱۶) علامہ اقبالؔ اور حیدرآباد دکن 84
(۱۷) علامہ اقبالؔ کی ازدواجی زندگی 88
(۱۸) علامہ اقبالؔ پر تہمت شراب نوشی 92
(۱۹) علامہ اقبالؔ اور آفتاب اقبال 100
(۲۰) اقبالؔ کیسے علامہ سے سر ہو گئے 105
(۲۱) معلم اقبالؔ شمس العلما میر حسن 109
(۲۲) علامہ اقبالؔ مشاہیر عالم کی نگاہ میں 112
(۲۳) علامہ اقبالؔ اور ٹیپو سلطان شہید 118
(۲۴) علامہ اقبالؔ اور ڈاکٹر راس مسعود 127
(۲۵) سپاس جناب امیرؔ 133
(۲۶) علامہ اقبالؔ اور مسئلۂ فلسطین 138
(۲۷) مولانا گرامیؔ اور علامہ اقبالؔ 145
(۲۸) مولانا ندوی سے علامہ اقبالؔ نے کیا دریافت کیا؟ 149
(۲۹) کیا داغؔ دہلوی کے سوا علامہ کسی کے شاگرد رہے؟ 153
(۳۰) مولانا گرامیؔ علامہ کے استاد کیوں نہیں؟ 157
(۳۱) خلاصہ مطالب مثنوی در تفسیر سورۂ اخلاص (فارسی) 171

نسخۂ دیانت

علامہ اقبالؔ (۱۸۷۷ء ۔ ۱۹۳۸) بیسویں صدی کے عظیم ترین مفکر اور فلسفی شاعر تھے اور میری نظر میں بیسویں صدی اقبالؔ کی صدی کہلائے گی۔ ان کا نثری اور شعری کلام اخلاقی اور روحانی اقدار پر مبنی ایک ایسے فلسفۂ حیات کا حامل ہے جس نے تمام عالم انسانیت پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس حکیمانہ کلام کا تقاضہ ہے کہ گاہے گاہے اسے ڈاکٹر سید تقی عابدی جیسے رمز شناس اور نکتہ سنج محقق میسر آتے رہیں جو اپنے ذوق سلیم اور اپنی مخلصانہ کاوشوں کو بروئے کار لا کر فکر و فلسفہ کے اس بحرِ بیکراں سے گراں مایہ موتی چُن کر نذرِ قارئین کرتے رہیں۔ زیرِ نظر نسخہ " اقبالؔ کے عرفانی اور فکری زاویوں کا مجموعہ " ایک ایسا ہی تحفہ ہے۔ اس کی تخلیق میں ڈاکٹر عابدی صاحب نے جس ادبی دیانت داری، محققانہ صلاحیت اور مطالعاتی گہرائی کا مظاہرہ کیا ہے وہ نہایت ہی قابلِ تحسین و ستائش ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ دلدادگان اقبالؔ اور اقبالیات کے طلبہ کے ساتھ ساتھ دنیائے اُردو ادب کے اہلِ نظر حضرات بھی اس مجموعہ کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

حضرت علامہ کی شخصیت اور اُن کے کلام کے بارے میں بہت کچھ تحریر ہونے کے باوجود ابھی بہت کچھ تحریر کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ باقیات اقبالؔ کے معیار اور ضخامت دیکھ کر احساس ہوتا ہے کی علامہ موصوف نے اپنے کلام کی تشہیر اور اشاعت میں جس احتیاط اور مصلحت کوشی سے کام لیا اُس سے اُن کی ذات کے کئی احسن پہلو عوام الناس سے پنہاں رہے۔ اس میں وقت کی سیاسیات مذہبی رجحانات اور دیگر عناصر کا عمل دخل کتنا تھا یہ تو قیاس ہی کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور کا انگریز نواز اور پنڈت نواز ماحول اس فرزندِ اسلام کو کیسے برداشت کرتا جس کی نگاہ میں ایک سحر تازہ کا نقشہ جگمگا رہا تھا اور جو ایک نئے زمانے کی طلوع کے خواب دیکھ رہا تھا۔

آب روان کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اُٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب (مسجد قرطبہ)

بقول حضرت فرمان فتحپوری "اقبال سب کے لئے" اقبال کو بیشتر کتابوں میں اب تک جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ اقبال کے مطالعہ کی راہیں ہموار کرنے کی بجائے مغالطے پیدا کرتا ہے۔ بہت سے مصنفین نے اقبال کے حقیقی افکار سے گریز کر کے اور اپنے متعصبانہ نقطہ نظر کے تابع ہو کر پیام اقبال کو ایسا چوں چوں کا مربّہ بنا دیا ہے کہ اس کا مطالعہ نہ صرف اقبالیات کے طلبہ کے لئے بلکہ اہلِ نقد و نظر کیلئے بھی ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے"۔[1]

اِن حالات کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ موجودہ نسل بلکہ آئندہ نسلوں کو از سر نو کلام و پیام اقبال سے بلا تعصب متعارف کروایا جائے۔ اس کلام کی ہمہ گیریت اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے کج فہم کم ظرف اور کوتاہ اندیش ناقدین کی آراء کے چنگل سے آزاد کر کے عوام الناس تک بلا گزند پہنچایا جائے۔ اس کام کیلئے ادبی دیانت داری، اقبال شناسی اور مخلصانہ محنت کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں اس بات کا احساس وقت گزر جانے کے بعد ہوا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اقبال کا یہ شعر ہم ہر صادق آجائے۔

؎ اب میری شہرت کی سوجھی ہے! کوئی دیکھے انہیں
مٹ کے میں جس دم غُبار کوئے رسوائی ہوا (باقیات اقبال)

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کی یہ تخلیق اِس ضمن میں ایک ایسا ہی احسن اقدام ہے۔ گو یہ مجموعہ کسی جامعیت یا حتمیت کا دعویٰ نہیں کرتا نہ ہی یہ اس بار کا متحمل ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے قارئین یقیناً مستفیض بھی ہوں گے اور اُن کے اقبال شناسی کے اشتیاق میں اضافہ بھی ہوگا۔

علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے فکر وفن کے بارے میں تحریری مواد کے بطور مطالعہ اور اس کے تحقیقی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں علامہ کے بارے میں قیاس آرائیاں اور غلط فہمیاں خطرناک حد تک موجود پائی جاتی ہیں اس کا ازالہ ضروری ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کہیں ایک موضوع پر علامہ کے خیالات یا اُن کی رائے معلوم کرنا مقصود ہو تو یہ مواد یکجا میسّر نہیں آتا۔ اگر کچھ مل بھی جائے تو وہ بغیر تصدیق اور بغیر حوالہ جات ہوتا ہے جسے آج کا سائنسی ذہن تسلیم نہیں کرتا۔ اس میدان پر پورا اترنے کیلئے لازم ہے کہ محقق نہایت احتیاط، محنت، بھرپور مطالعہ اور چھان بین کے بعد کوئی رائے پیش کرے اور اس ضمن میں کسی بھی معلوماتی عنصر کو نظر انداز نہ کرے۔ یہ اقبال شناسی کا تقاضا ہے۔ اقبال خود ہر فن میں کمال کے داعی تھے۔

انساں کو فکر چاہیے ہر دم کمال کی
کسبِ کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

ڈاکٹر تقی عابدی نے اُسی کمال کی جستجو میں اپنا قلم اٹھایا ہے اور اُسی ادبی ذہانت اور مخلصانہ کاوش کا مظاہرہ کیا ہے جس کی ضرورت تھی۔ علامہ کی شخصیت کے جن پہلوؤں کو اس مجموعہ میں زیر بحث لایا گیا ہے اُن کیلئے دلائل اور تحریری ثبوت فراہم کرنا ایسی دستاویزات کا متقاضی تھا جو قدرے ناپید ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت ذمہ داری سے ان لوازمات کو نبھایا ہے جس کیلئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ بابائے صحافت جناب ضمیر جعفری مرحوم جنہوں نے ڈاکٹر عابدی کو ''نیویارک کے جمیل جالبی'' کا خطاب دیا تھا اگر آج حیات ہوتے اور ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ کے معمول کو دیکھتے تو وہ انہیں '' کتابی کیڑا '' نہیں '' کتابی مگرمچھ '' کہتے۔ وہ اس لئے کہ ورق گردانی اور کُتب خوانی میں جو سبک رفتاری انہوں نے دکھائی ہے ہوخیرہ کردینے والی بات ہے کہ اس برق رفتار ماحول اور پیشہ طب کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اتنا کچھ اتنے کم وقت میں کر دکھایا۔ دبستانِ اُردو سے ہزارہا میل دور نیوفاؤنڈ لینڈ کینیڈا میں بیٹھ کر اردو کتابوں کے ایک ضخیم ذخیرے کا حصول کسی معجزے سے کم نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مدّبرانہ مضمون، کالم اور مقالے اردو کے معتبر جرائد اور رسالوں میں باقاعدگی سے

چھپتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی شخصیت تنقید اور تحقیق کے حوالے سے اردو ادبی حلقوں میں ممتاز و معتبر مانی جاتی ہے۔ اقبالؔ کے حوالے سے اتنے سنجیدہ اور نازک موضوعات پر علم اٹھا کر اُن سے کما حقہ انصاف کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ عابدی صاحب نے یہ کر دکھایا ہے، جس کیلئے وہ لائق مبارکباد ہیں۔

(حُسن اتفاق دیکھئے کہ اظہارِ خیال کی یہ سعادت مجھے ماہِ اگست کے ان لمحات میں نصیب ہو رہی ہے جو تمام برِ صغیر کیلئے مژدۂ آزادی بن کر آئے تھے۔ روئے سخن اُس ہستی کی جانب ہے جسے سراپا آزادی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ علامہ اقبالؔ آزادی کے پیامبر بھی تھے، منزلِ آزادی کے خضرِ راہ بھی اور جد و جہدِ آزادی کے علمبردار بھی۔ انسانی حقوق کے تحفظ میں اُن کا پیام ایک مجسم آئینِ انسانیت کی مثال ہے۔)

آخر میں اپنے ذاتی حوالے سے اتنا کہوں گا کہ اس تحقیق نے ڈاکٹر عابدی کو ایک منفرد اور ممتاز فہرست میں شامل کر کے انہیں ایک نیا تشخص عطا کیا ہے۔ انہوں نے علامہ اقبالؔ سے وہ تعلق قائم کر لیا ہے، جس نے انہیں اب کلام و پیامِ اقبالؔ کی طرح ابدیت عطا کر دی ہے۔ اقبالؔ خود کہتے ہیں کہ

؎ اقبالؔ میرے نام کی تاثیر دیکھئے
میں جس کے ساتھ ہوں اُسے ممکن نہیں شکست

ظاہر ہے کہ یہ مژدہ جسے خود اقبالؔ کی جانب سے ملے اُس کے لئے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے۔ اقبالؔ سے وابستگی اہلِ قلم حضرات کیلئے باعثِ افتخار ہی نہیں باعثِ نصرت بھی ہوا کرتی ہے۔ بارگاہِ ایزدی میں میری دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس تعلق کے استوار رکھنے کی ہمت اور مہلت ملتی رہے اور وہ اس وابستگی کا اظہار اپنی تخلیقات کی صورت میں آئندہ بھی نہایت دل پذیر اور موثر انداز میں کرتے رہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمان عبدؔ
۱۳؍ اگست ۲۰۰۰ء

علامہ اقبالؔ کی دعا

اگرچہ دعا کا لفظ عربی ہے لیکن یہ سہ حرفی لفظ اردو اور فارسی میں کسی ترجمہ اور تفسیر کا محتاج نہیں۔ دین اسلام نے مسلمانوں کو دنیا اور عقبیٰ کے لیے دعا کرنے کی تاکید کی ہے۔ انسان عموماً اُن خواہشات کے لیے دعا کرتا ہے جس میں اُس کو امداد غیبی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دعا کے عنوان کے ذیل میں اسلامی علماء نے بتلایا ہے کہ دعا کسے کہتے ہیں؟ دعا کس سے مانگی جاتی ہے؟ دعا کس طرح کی جاتی ہے؟ دعا کس چیز کی کرنا چاہیے؟ دعا میں وسیلہ کی کیا اہمیت ہے وغیرہ مختلف طویل بحثیں ہیں جن کا ذکر یہاں خارج از محل ہے۔

علامہ اقبالؔ نے بانگ درا میں ''بچے کی دعا'' اور ''دعا'' کے زیر عنوان اُردو میں دو نظمیں لکھیں جن میں علامہ نے بچے کے توسط سے اور دوسری نظم میں کلمہ گو کے لیے دعا لکھی۔ اِن نظموں کے علاوہ بھی علامہ نے کئی اشعار میں دعا کے موضوع کو بڑے خاص طریقے سے پیش کیا۔

جس دعائیہ نظم کی بابت یہ مضمون بیان کیا جا رہا ہے وہ علامہ کی فارسی نظم "دعا" ہے جو زبور عجم میں تمہید کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ یہ سات اشعار پر مشتمل نظم اقبالؔ نے صرف اپنے لیے کہی ہے۔ اس نظم کے تجزیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے جو دعائیں مانگی تھیں وہ سب کی سب قبول ہوئیں۔ یہ نظم لفظ '' یارب'' سے شروع ہو کر بدہ یعنی '' دے '' پر ختم ہوتی ہے۔ عام انسانوں کی دعاؤں میں شخصی مسائل اور دنیاوی معاملات جن میں مال، عزّت، اولاد، طولِ عمر، کسب جاہ و حشم جیسے امور شامل ہوتے ہیں لیکن علامہ کی دعا میں ایسی کوئی چیز شامل نہیں۔ اگرچہ یہ دعا براہ راست موصوف کے لیے تھی۔ لیکن ان تمام دعاؤں کا مقصد ملّتِ اسلام کی بہبود اور سرخ روئی کے سوا کچھ نہ تھا اس موقعہ پر اس عظیم دعا کا مختصر سا جائیزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

شعر(۱) یارب درون سینہ دل باخبر بدہ در بادہ نشہ را نگرم آن نظر بدہ

(ترجمہ) اے خدا میرے سینے کے اندر باخبر دل دے۔ ایسی نظر دے جو شراب میں بھی پوشیدہ نشہ کو دیکھ سکے۔ قرآن اور احادیث کی روشنی میں مومن کی شناخت اُس کا بیدار باخبر دل ہے جو ہر لحظہ

صفحۂ ہستی پر لکھی ہوئی آیاتِ معرفت کی تلاوت کرتا ہے۔ اسی لیے تو کسی اور مقام پر علامہ نے فرمایا۔

کافری بیدار دل پیشِ صنم　　بہہ بہ دینداری کہ خفتے در حرم

(ترجمہ) ایک کافر بیدار دل کے ساتھ اپنے بت کے سامنے اُس مسلمان سے بہتر ہے جو کعبہ میں مردہ دل لیے بیٹھا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ دعا اقبالؔ کی ایسی مستجاب ہوئی کی اقبالؔ ایک باخبر زندہ دل شاعر کے نام سے مشہور ہوئے۔ دوسری دعا۔ ایسی نظر دے کہ شراب میں پوشیدہ نشہ کو دیکھ سکوں۔ اِس نظر کو نظرِ معرفتِ الٰہی کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے جس کے توسط سے حق کو پہچانا جاتا ہے کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں خدا کا وجود موجود ہے۔ صرف نظرِ بصیرت چاہیے۔ صحیح تو یہ ہے کہ یہ دعا بھی اقبالؔ کی مستجاب ہوئی اور اقبالؔ نے اپنی دیدہ ریزی سے وہ مطالب کشف کیے کہ دنیا نے آپ کو اقبال لاہوری کے نام سے یاد کیا۔

شعر (۲) این بندہ را کہ بانفس دیگران نزیست　　یک آہِ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ

(ترجمہ) اس بندہ کو دوسروں کے خیراتی سانسوں پر زندہ نہ رکھ۔ سحر کی طرح ایک ذاتی شعلہ اور روشن آہ عطا کر دے۔

اقبالیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ علامہ نے اپنے مقام یا اپنے کلام کی بلندی کے لیے کسی کی مدد حاصل نہیں کی بلکہ اس سنگلاخ وادی کو اپنی محنت و مشقت اور تائیدِ الٰہی کے ذریعہ عبور کیا چوتھی دعا میں فرماتے ہیں مجھے سحر کی طرح ایک ذاتی روشنی اور روشن آہ عطا کر دے۔

اگرچہ علامہ نے مولانا رومؔ سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن خودی، رموزِ بے خودی کے فلسفوں میں جو کچھ روشنائی نظر آتی ہے وہ سب اُن کی ذاتی بصیرت اور پاکیزگیٔ خیال سے ہے یہ دونوں دعائیں بھی اقبالؔ کی زندگی ہی میں مورد قبول درگاہ ایزدی ہو گئیں تھیں۔

شعر (۳) سیلم مرا بجوی تنگ مایۂ مپیچ　　جولا نگہی بوادی وکوہ و کمر بدہ

(ترجمہ) مرے خیالات کے سیلاب کو تنگ نہروں سے مت گذار بلکہ اس کو وادیوں، کوہساروں، اور میدانوں میں بکھیر دے۔ علامہ اقبالؔ کو گذرے ہوئے ساٹھ (۶۰) سال کا عرصہ ہوا ہے۔ آج

علامہ اقبالؔ کا شمار مولانا رومؔ کے بعد سب سے مشہور مشرقی شاعر میں ہوتا ہے۔ علامہ کا کلام تقریباً دنیا کی ہر بڑی زبان میں ترجمہ اور تشریح ہو چکا ہے۔ اقبالیات پر اس نصف صدی میں تقریباً بارہ سو سے زیادہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ کیا اب بھی کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ یہ دعا اقبالؔ کی قبول نہ ہو سکی؟

شعر(۴) سازی اگر حریف یم بیکران مرا   با اضطراب موج سکون گہر بدہ

(ترجمہ) کیونکہ مرا حریف موجود ہے اس لیے میرے دریائے بیکران کو موجوں کا اضطراب اور مروارید کا سکون عطا فرما۔ علامہ کی زندگی میں ان کے کلام اور پیام کو سمجھے بغیر نام نہاد لیڈروں اور بعض مسلم علماؤں کی جانب سے شدید مخالفت کی گئی۔ کفر کے فتوی منبروں سے دیئے گئے۔ شکوہ کی کتابیں خرید خرید کر جلائیں گئیں لیکن یہ گرد کارواں اور دم گھٹانے والا دھواں دیر پا نہ رہا۔ اقبالؔ کے خیالات کا موجیں مارتا سمندر اور گہر دار ندرت فکر کے موتی عوام کے نصیب ہوئے۔ خدا نے اقبالؔ کی اس دعا کو بھی سرفراز کیا، چنانچہ اقبالؔ انگریز کی دہلیز پر سر نہیں ہوئے بلکہ آستان محمدی پر سرفراز ہو گئے۔

شعر(۵) شاہین من بصید پلنگان گذاشتی   ہمت بلند و چنگل از ین تیز تر بدہ

(ترجمہ) جب تو نے میرے شاہین کو چیتوں کے شکار پر مامور کیا ہے تو اُسے بلند ہمت اور تیز پنجہ سے مسلح کر دے۔ کون اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ علامہ اقبالؔ کی تمام زندگی بڑی بڑی طاقتوں اور اہم شخصیتوں سے دست و پنجہ زم کرنے میں گزری۔ اتہام، بہتان، الزام کے ساتھ ساتھ مشرق و مغرب کی شرارتیں آپ کی کمین میں تھیں لیکن اس جنگ و جدل میں بھی آخر کار اقبالؔ فتح یاب اور اقبال رہے اور اقبالؔ کے اشعار شاہین کے پنجوں کی طرح درندوں کو دریدتے رہے۔

شعر(۶) رفتم کہ طایران حرم را کنم شکار   تیری کہ نا فگندہ فتد کار گر بدہ

(ترجمہ) میں حرم کے پرندوں کے شکار کے لیے جا رہا ہوں۔ مجھے ایسے تیر دے جو ہدف پر لگیں اور جو ٹوٹ کر بیکار نہ ہو جائیں۔

علامہ اقبالؔ کی مثنوی سورہ اخلاص کا پہلا مکمل ترجمہ

اگرچہ اُردو اور فارسی کے بعض شعرا نے قرآنی آیات اور احادیث کا منظوم ترجمہ کیا ہے لیکن میرے محدود مطالعہ میں سوائے علامہ اقبالؔ کے کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آتا جس نے قرآن کے ایک مکمل سورہ کی تفسیر اس انداز میں کی ہو ۔علامہ اقبالؔ نے رموز بے خودی میں خلاصہ مطالب مثنوی کے زیرعنوان سورہ اخلاص کی تفسیر (۱۱۵) فارسی اشعار میں کی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبالؔ احادیث اور قرآن پر گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور اِسی وجہ سے اِن کا کلام الہیات کا آئینہ محسوس ہوتا ہے علامہ نے اپنی نگارشات میں قرآن مجید کی منظوم تفسیر کا بھی ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن صحت کی خرابی اور بڑھتی ہوئی مصروفیات نے اس خواہش دیرینہ کو مکمل ہونے نہ دیا۔سورہ اخلاص جس کو سورہ توحید بھی کہتے ہیں قرآن مجید کا (۱۱۲) واں وہ عظیم معنی و معرفت خیز سورہ ہے جس کی بابت ابن عباسؓ حضورؐ اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ اس سورہ کی عظمت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے اور تمام معارف اُصولی ' فروعی اور اخلاقی اس میں بیان کیے گئے ہیں۔علامہ اقبالؔ نے اس چار آیات کے چھوٹے سے سورہ کی تفسیر کر کے دراصل ایک تہائی قرآن کی تفسیر کی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ اِس کے سمجھنے کے لئے اس کی ترجمانی کی جاسکتی ہے۔ہمارے دور کے مشہور مفسرِ قرآن آیت اللہ طباطبائی جنھوں نے ''المیزان'' میں قرآن کی مکمل تفسیر قرآن کی آیات ہی سے کی ہے فرماتے ہیں قرآن مجید کا ہر لفظ مفصّل اور اصل ہے اور اُسکا ترجمہ نقل اور بدل ہو ہی نہیں سکتا مثال کے طور پر ''حمد'' کا ترجمہ ''تعریف'' کیا جاتا ہے جب کہ خود ''تعریف'' لفظ عربی ہے چنانچہ خود خدا ''الحمد '' کی جگہ ''التعریف'' بیان کرسکتا تھا ' یعنی حمد کا مکمل بدل تعریف نہیں ہوسکتا ' بلکہ لفظ تعریف ''حـــمـــد'' کی کسی حد تک کہ ترجمانی کرسکتا ہے تا کہ اِس کے معنی ہماری سمجھ میں آسکیں۔

سورہ اخلاص کی چار آیات میں خداوندے عالم نے اصول ' فروع اور اخلاق کے بیکراں دریاؤں کو جن الفاظ کے کوزوں میں بند کیا ہے اُن میں چار لفظ **الله ، احد ، صمد** اور **کفو** قابل

علامہ اقبالؔ کی یہ انوکھی اور دلچسپ دعا ہے۔ اس دعائیہ شعر میں طائیران حرم یعنی نام نہاد مسلمان علماء اور نادان مولویوں کی طرف اشارہ ہے جو عوام کو اپنے ظاہری لباس سے دھوکا دیتے ہیں اور اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں چنانچہ ان کو افشا کرنا بڑا دشوار کام ہوتا ہے۔ یہ بُت جو اسلامی لبادہ اوڑھے ہوئے تھے علامہ نے نہ صرف انھیں بے نقاب کیا بلکہ نابود کر دیا۔ یعنی علامہ کی دعا مؤثر اور معتبر رہی۔

علامہ نے اس نظم کے آخری شعر میں دو دعائیں کیں۔ فرماتے ہیں۔

شعر(۷) خاکم بہ نور نغمۂ ای داودؑ برفروز ہر ذرہ ئ مرا پرو بال شرر بدہ

(ترجمہ) میری خاک کو حضرت داودؑ کے نغمہ کے نور سے روشن کر دے۔

میرے ہر ذرّہ کو شعلے کے ذرّوں کی طرح قوت پرواز عطا کر دے ۔

علامہ اقبالؔ کا کلام قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ کا آئینہ ہے۔ خدا کی معرفت اور عشق رسالتؐ میں ڈوبے ہوئے یہ ترانے جبعلامہ اپنے زم ترنم میں پیش کرتے تو لوگوں پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یہی تو نغمہ داودؑ کی دین تھی اور یہی تو دعا قبولیت کے آستانہ پر تھی۔ علامہ نے اپنی خاک کے ہر ذرّہ کو شعلہ فشانِ رازِ درون کر دیا اور اس نفس گرم کو شعروں میں ایسا پیوست کیا کہ آج بھی ہر شعر قاری کے خون کو جوش میں لانے اور اُس کی آہِ سرد کو آتشِ خرمن کفر بنانے کے لیے کافی ہے۔ یہ دس دعائیں علامہ نے سات اشعار میں مانگیں اور سب مستجاب ہوئیں۔

اِس گفتگو کے اختتام پر میں علامہ اقبالؔ کا وہ شعر جو اُنہوں نے مسلمانوں سے خطاب کر کے فرمایا ہے رقم کرتا ہوں۔

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

ذکر و فکر ہیں اور اِسی معرفت کے دریا میں غوطہ زن ہو کر علامہ نے (۱۱۵) اشعار پر مبنی جو مثنوی لکھی اُس سے ظاہر ہے کہ علامہ نہ صرف مفکرِ اسلام بلکہ ایسے مفسّرِ قرآن تھے کہ دیگر مفسّرین ان کی فکر معرفت کی گرد تک نہیں پہنچ سکے۔ ع۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

علامہ نے سورہ اخلاص کی پہلی آیت قل ھو اللہ احد پر (۱۸)، دوسری آیت اللہ الصمد پر (۵۱) تیسری آیت لم یلد ولم یولد پر (۱۹) اور چوتھی آیت ولم یکن لہ کفواً احد پر (۲۱) اشعار نظم کیے۔ اگرچہ یہ مثنوی (۸۰) سال قبل فارسی میں لکھی گئی اور منظرِ عام پر آئی جس کے چیدہ چیدہ دو چار اشعار کے ترجمے اُردو میں ہوئے لیکن یہ پہلا مکمل اُردو میں ترجمہ ہے۔

(۱) میں نے رات خواب میں صدیق کو دیکھا اور اُن کے راستے کی خاک سے پھول چنے۔

(۲) وہ ہمارے مولا کا سکون وہ ہماری وادیٔ سینا کا پہلا کلیم ہے۔

(۳) اُس کی ہمت ملّت کی زراعت کے لیے ابر کی مانند ہے اور وہ خود ثانیٔ اسلام و غار یار و بدر اور قبر ہے۔

(۴) میں نے اُس سے کہا اے اعلیٰ صفات والے عشقِ خاص تیری محبت تو دیوانِ عشق کا مطلع ہے۔

(۵) تیرے ہاتھوں سے ہمارے کام تکمیل ہوئے ہیں چنانچہ ہماری مصیبتوں کو حل کرنے میں مدد کر۔

(۶) فرمایا۔ آخر کب تک تو لالچ اور ہوس کا غلام رہے گا اب سورہ اخلاص سے روشنی اور عظمت حاصل کر۔

(۷) یہ ایک نفس جو مومنوں میں گردش کرتا رہتا ہے توحید کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔

(۸) اُسی کے رنگ میں رنگ جا اور دنیا میں اُس کے جمال کا نقش بن جا۔

(۹) جب تو نے اپنا نام مسلمان رکھا ہے اور شرک سے توحید کی طرف رخ کیا ہے۔

(۱۰) کیوں اپنے آپ کو ترکی اور افغانی کہہ رہا ہے۔ تجھ پر افسوس کہ تو وہی کا وہی باقی ہے اور اپنے کو بدل نہ سکا۔

(۱۱) مختلف ناموں سے اپنے آپ کو آزاد کر یعنی صراحی پر گذارا کر اور ساغروں کو چھوڑ دے۔

(۱۲) تو اپنے ناموں اور گروہ بندی کی وجہ سے رسوا ہوا ہے اور کچے میوہ کی طرح درخت سے گر گیا ہے۔

(۱۳) وحدت کو برقرار رکھ اور گروہ بندی سے کنارہ کشی کر۔ اپنی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے مت کر۔

(۱۴) اگر تو توحید کا پرستار ہے تو کب تک سبق گروہ بندی پڑھتا رہے گا۔

(۱۵) تو نے اپنے اوپر خود اپنا دروازہ بند کر لیا ہے۔ جو باتیں تیرے ہونٹوں پر ہیں انھیں دل میں بھی اُتار لے۔

(۱۶) تو نے ایک ملت سے سو ملتیں بنالیں اور اس طرح خود اپنی فصیلوں پر حملہ کیا ہے۔

(۱۷) ایک ہو جا اور توحید کا پرچار کر اور جو چیز غائب ہے اس کو اپنے عمل سے موجود کر۔

(۱۸) عمل سے ایمان کی لذت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ ایمان مردہ ہے جس میں عمل نہ ہو۔

(۱۹) اگر تو نے اللہ الصمد سے صحیح دل لگایا ہے تو سمجھ لے تو نے دنیا کی دامن گیر حدوں سے آزادی حاصل کر لی۔

(۲۰) اللہ کا بندہ دنیا کی چیزوں کا غلام نہیں ہے اور اُس کی زندگی ڈول کی مانند نہیں جو صرف بھر کر خالی ہو جاتا ہے۔

(۲۱) اگر تو مسلمان ہے تو غیروں کی منت نہ کر بلکہ تمام جہاں کے لیے نیکی اور اچھائی کی مثال بن جا

(۲۲) دولت مند کے آگے اپنے روزگار کی شکایت نہ کر اور اپنے ہاتھ کو دوسروں کے سامنے مت پھیلا

(۲۳) حضرت علیؓ کی طرح جو کی روٹی پر زندگی بسر کر اور مرحب کی گردن توڑ کر قلعہ خیبر کو حاصل کر۔

(۲۴) اہل بخشش کی منت کیوں کی جائے اور اُن کے ہاں اور نہیں کے خنجر کے زخم کیوں کھائیں جائیں۔

(۲۵) اپنے رزق کو پست افراد کے ہاتھوں سے مت لے کیونکہ تو یوسفؑ کنعان ہے اس لیے خود کو سستا فروخت نہ کر۔

(۲۶) اگرچہ تو ایک بے بال و پر کی چیونٹی ہی سہی لیکن اپنی حاجت حضرت سلیمانؑ سے بھی بیان نہ کر۔

(۲۷) راستہ بہت کٹھن اور دشوار ہے اس لیے اپنے ساتھ سامان کم رکھ اور چونکہ اس دنیا میں آزاد پیدا ہوا ہے اس لیے تجھ کو آزاد ہی مرنا چاہیے۔

(۲۸) قنعہ اقلل من الدنیا کو شعار کر اور تعش حراً سے سرمایہ دار بن (قول فاروق ہے)

(۲۹) کوشش کر کہ کیمیا بن اور خاک مت رہ ' دنیا میں اہل بخشش بن اور فقیر مت رہ۔

(۳۰) اے ابوعلی کے مقام کو جاننے والے ایک گھونٹ بوعلی کے جام سے بھی نوش کر۔

(۳۱) تخت کیکاوس کو ٹھوکر مار دے، سر کو قربان کر دے مگر عزت اور ناموس کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔

(۳۲) خود بخود میخانہ کا دروازہ کھل جائے گا اُن بے نیازوں پر جن کے پیمانے خالی ہیں۔

(۳۳) اسلامی قاید ہارون رشید جس کی تلوار کا مزہ روم کے شہنشاہ فقفور نے چکھا تھا۔

(۳۴) مالک سے کہا اے قوم کے مولا آپ کے در کی خاک سے قوم کی قسمت روشن ہے۔

(۳۵) اے گلزار حدیث کے نواسنج تجھ سے حدیثوں کے رازوں کے درس چاہتا ہوں۔

(۳۶) کب تک لعل پردوں میں چھپا رہے گا اُٹھو اور دارالخلافت میں تشریف لاؤ۔

(۳۷) خوش رنگ ہے عراق کے دنوں کی روشنی اور خوش حال ہے حُسنِ نظر اور سوزِ عراق۔

(۳۸) آبِ خضر (آبِ حیات) اُس کی ٹہنی سے ٹپکتا ہے اور مسیحا کا زخم کا مرہم اُس کی خاک ہے۔

(۳۹) مالک نے کہا میں مصطفیٰ ؐ کا غلام ہوں اور میرے سر میں سوائے اُس کے عشق جنوں کے اور کچھ نہیں۔

(۴۰) میں شکار کے تھیلے کے مانند ہوں اور میں اس حریم پاک سے اُٹھ نہیں سکتا۔

(۴۱) میں خاک یثرب کی خوشبو سے زندہ ہوں اور عراق کے دن سے یہاں کی رات اچھی ہے۔

(۴۲) عشق کہتا ہے کہ میرا کہنا مان اور بادشاہوں کو خدمت گذاروں کی طرح بھی ساتھ مت رکھ۔

(۴۳) تو چاہتا ہے کہ میرا آقا بن جائے اور مجھ جیسے آزاد بندہ کا مولا بن جائے۔

(۴۴) تعلیم کے لیے تیرے دروازے پر آئے ہیں ' ملّت کا خادم تو تیرا نوکر نہیں بن سکتا۔

(۴۵) اگر علم دین سے فایدہ اٹھانا چاہتا ہے تو میرے حلقۂ آموزش میں بیٹھ۔

(۴۶) بے نیازوں کے عجیب ناز ہوتے ہیں اور ان کے ناز کے انداز بھی عجیب ہوا کرتے ہیں۔

(۴۷) بے نیاز رہنا حق کے رنگ میں رنگ جانا ہے اور تمام رنگ سوائے پیراہن کے رنگ کے دھوئے کے برابر ہیں۔

(۴۸) تو نے غیروں کا علم سیکھا یعنی اپنی صورت پر اغیار کا غازہ ملا ہے۔

(۴۹) یہ بڑائی اور عزت کو تجھ سے چھین لیتی ہے اور مجھے نہیں معلوم اب وہ تو ہی ہے یا کوئی دوسرا۔

(۵۰) تیری خاک نے اس کی نسیم سے فایدہ نہیں اُٹھایا چنانچہ گل اور ریحان سے گود خالی رہی۔

(۵۱) اپنی کشت اپنے ہاتھوں سے برباد مت کر اور ابروں سے بارش کی بھیک مت مانگ۔

(۵۲) تیری عقل غیروں کی فکر کی اسیر ہے اور تیرے حلق میں غیروں کے نفس کی آواز ہے۔

(۵۳) تیری زبان پر دوسرے سے لی ہوئی ادھار گفتگو اور تیرے دل میں دوسروں کی ادھار آرزوئیں ہیں

(۵۴) تیری قمریوں کو نواؤں نے چاہا اور تیرے سرو کو قباؤں نے چاہا۔

(۵۵) دوسروں سے شراب اپنے ساغر میں لے رہا ہے اور وہ بھی ساغر جو دوسروں سے قرض میں لیا ہوا ہے

(۵۶) وہ اُن کی نگاہ ما ذاغ البصر کاش اگر اپنی قوم کی جانب پلٹ آئے۔

(۵۷) شمع صرف پروانے کو جانتی ہے اور اپنے اور غیروں میں فرق محسوس نہیں کرتی۔

(۵۸) میری قوم میں سے نہیں ہے جو ہمارے حضور گفر مار ہے ہیں۔ افسوس صد افسوس اور وائے ہو تجھ پر۔

(۵۹) ستاروں کی طرح زندگانی کب تک کرو گے اور اپنی ہستی کو کب تک سحر میں گم کرتے جاؤ گے۔

(۶۰) تو دھوکا صبح کاذب سے کھا چکا اور اپنا بچھونا افلاک کی وسعت سے اُٹھا چکا ہے۔

(۶۱) تو سورج ہے اگر اچھی طرح سے اپنے آپ کو دیکھے اس لیے تجھے دوسرے ستاروں سے روشنی خریدنے کی ضرورت نہیں۔

(۶۲) اپنے دل پر دوسروں کا نقش اُتارا ہے اور خاک کو نور کے بدلے حاصل کیا ہے۔

(۶۳) کب تک دوسروں کی روشنی سے چمکے گا اور کب تک دوسروں کی شراب سے مست رہے گا۔

(۶۴) کب تک غیروں کی محفلوں کے چراغ کا طواف کرے گا اگر تجھ میں ہمت ہے تو اپنی خودی کی آگ میں جل اور جہان کو روشن کر۔

(۶۵) نظر کی طرح اپنے ہی پیروں پر چل ' اچھل مگر اپنی ہی جگہ قائم رہ۔

(۶۶) اے عقلمند دنیا میں حباب کے مانند اپنے خلوت خانہ کو غیروں پر بند رکھ۔

(۶۷) کبھی صرف ایک ایک فرد نے بھی خود کو منوایا اور کبھی قوم نے بھی اپنے ساتھ ساخت اور باہمی کام

انجام دیا۔

(۶۸) مصطفیٰؐ کے پیام سے آگاہ ہو جا اور ارباب دون اللہ سے نجات حاصل کر۔

(۶۹) تیری قوم رنگ اور خون حسب اور نسب سے بلند تر ہے۔ یہاں ایک کالے کی قیمت بھی سو گوروں سے بڑھ کر ہے۔

(۷۰) جناب قنبر (حضرت علیؑ کے غلام) کے وضو کے پانی کے ایک قطرے کی قیمت روم کے شہنشاہ کے خون سے بڑھ کر ہے۔

(۷۱) تو قوم، قبیلہ اور خاندان کی بندیشوں سے آزاد ہو کر حضرت سلمانؓ فارسی کی طرح اسلام کا فرزند ہو جا۔

(۷۲) اے ہوشیار ساتھی اس نکتہ پر غور کر شہد کو شہد کے چھتے کے خانوں میں دیکھ کر سبق سیکھ۔

(۷۳) جس میں ایک قطرہ گلِ لالہ سے ہے تو ایک قطرہ نرگسی پھول سے ہے۔

(۷۴) ایک قطرہ یہ نہیں کہتا کہ میں نرگس کے پھول سے ہوں اور دوسرا یہ نہیں کہتا کہ میں نیلوفر کے پھول سے ہوں۔

(۷۵) ہماری ملت کی شان ابراہیمیؑ ہے اور ایمان ابراہیمیؑ ہی ہمارا شہد ہے۔

(۷۶) اگر نسب اور قبیلہ اور خاندان کو ملت کا جزو بناؤ گے تو اسلامی برادری میں شگاف ڈالو گے۔

(۷۷) ہماری سرزمین میں یہ منحوس جڑیں کبھی بھی مستحکم نہ ہونے پائیں کیوں کہ غیر مسلم ہماری تاک میں بیٹھے ہیں۔

(۷۸) ابن مسعود جو عشق کا روشن چراغ ہے جسکے جسم اور جان سرتاپا عشق کی آگ میں جلتے رہیں ہیں۔

(۷۹) اس کا سینہ بھائی کی موت سے جل اُٹھا اور درد و حرارت سے احساس کا آئینہ پانی پانی ہو گیا۔

(۸۰) اُس نے اپنے رونے کو ختم نہیں کیا بلکہ وہ غم میں ایک ماں کی طرح روتا رہا۔

(۸۱) اے افسوس وہ جو نیاز کا سبق پڑھتا ہے میرا دوست جو مدرسہ نیاز کے اندر تھا۔

(۸۲) آہ وہ سروِ چمن جو عشق نبیؐ کے راستے میں میرا ہم سفر اور ہم پیالہ تھا۔

(۸۳) افسوس کہ وہ نبیؐ کے دربار سے محروم اور میری آنکھیں دیدار نبیؐ سے روشن ہیں۔

(۸۴) ہمارا رشتہ اور تعلق روم اور عرب سے نہیں ہے اور ہمارے رشتے کو نسب کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

(۸۵) ہم نے اپنا دل حضورؐ سے باندھا ہے اور اسی رشتے سے ہم ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہیں۔

(۸۶) ہمارا رشتہ صرف حضورؐ کی محبت سے ہے اور ہماری آنکھوں کے لیے اُن کی صبا کا خمار کافی ہے۔

(۸۷) جب اُس کے نقہ کا اثر ہمارے خون میں دوڑتا ہے تو وہ فرسودہ عقائد کو جلا کر اپنی روشنی پیدا کرتا ہے۔

(۸۸) حضورؐ کا عشق ملّت کا سرمایہ ہے اور ملّت کی رگوں میں خون کی طرح بھرا ہوا ہے۔

(۸۹) عشق ہی جسم کی جان اور نسب ہے اور عشق کا رشتہ نسب کے رشتے سے مستحکم تر ہے۔

(۹۰) اگر عشق کرنا ہے تو نسب کی بندشوں کو چھوڑا جائے اور ایران و عرب کے تفرقوں سے کنارہ کشی کیجائے۔

(۹۱) حضورؐ کی امت بھی حضورؐ کی طرح حق کا نور ہے۔ اسلئے ہمارا وجود حضورؐ کے وجود سے ہی قابل شناخت ہے۔

(۹۲) نورِ حق کی ابتدا اور وجود کے بارے میں جب کوئی تحقیق نہیں کر سکتا تو کیا ضرورت ہے کہ حق کی خلقت کے نسب اور نسل پر تحقیق کی جائے۔

(۹۳) ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو قبیلہ اور خاندان کی بندیشوں میں بند رکھے وہ " لم یلد ولم یولد " سے بالکل بے خبر ہے۔

(۹۴) مسلمان نے دنیا سے کیا آنکھیں موڑ لیں ہیں اور دل کی فطرت حق سے پیوستگی کیا ہے۔

(۹۵) وہ لالہ جو پہاڑ کی چوٹی پر اُگتا ہے وہ کبھی گل چین کے دامن کو نہیں دیکھ نہیں سکتا۔

(۹۶) اُس کی آگ شعلے بلند کرتی ہے زمین پر سحر کی پہلی ساعتوں میں۔

(۹۷) آسمان نے اپنے آغوش سے نہیں نکالا وہ تارہ جو اُس کے غرور و تکبر کا وسیلہ تھا۔

(۹۸) پہلے سورج کی کرن نے اُس سے پیار کیا اور شبنم نے اُس کی آنکھوں سے خواب کی گرد کو دھویا۔

(۹۹) لم یکن یعنی خدا سے رشتہ ایسا مظبوط کیا جائے کہ تو ساری اقوام عالم میں یگانہ اور بے مثال رہے۔

(۱۰۰) جب خدا کی ذات واحد اور لاشریک ہے جو اس کے بندے کو بھی بے مثال اور یگانہ ہونا چاہیے۔

(۱۰۱) مومن ہر بلندی سے بلند تر ہے۔ اور اور اس کی عزت کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا۔

(۱۰۲)لا تحزنو کی پوشاک اس کے تن پر ہے اور "انتم الاعلون" کا تاج اُس کے سر پر ہے۔

(۱۰۳)وہ اپنے کاندھوں پر دو عالم کا بوجھ اُٹھاتا ہے اور بَرِ اعظم بھی اُس کی آغوش میں پلتے ہیں۔

(۱۰۴)آواز تیز ہمیشہ گوش زد ہوتی ہے اور اگر بجلی بھی گرے تو یہی اپنے بازو پر لے لے گا۔

(۱۰۵)اُس کی چنگاری کی مٹھی میں سو شعلے ہیں اور اس کی زندگی اُس کے جوہر سے کمال پر پہنچتی ہے۔

(۱۰۶)اس دنیا کے شور و شین میں اُسے کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی سوائے مومن کی تکبیر کی دل نشین آواز کے۔

(۱۰۷)اُس کا عدل بخشش اور احسان بہت عظیم ہے اس کے مزاج کے اندر قہر بھی ہے اور وہ کریم بھی ہے۔

(۱۰۸)اُس کی نوا بزم کی دلنشین آواز ہے اور اُس کی رزمگاہ کی گرمی آہن پگھلا دیتی ہے۔

(۱۰۹)وہ گلستانوں میں بلبلوں کے ہمراہ ہم آواز ہے اور بیابانوں میں باز کی طرح شکاری ہے۔

(۱۱۰)اس کا دل آسمانوں کے نیچے آرام نہیں لیتا بلکہ اس کا وجود افلاک پر سکون حاصل کرتا ہے۔

(۱۱۱)اس کی فکر کا طائر پرواز سورج پر چونچ مارتا ہے اور اُس کا خیال آسمانوں کے اُس پار معرفت کے نور سے روشن ہے۔

(۱۱۲)تو نے پرواز کے لیے اپنے پر نہیں کھولے اور تو ایک کیڑے کی طرح خاک میں آرام سے لیٹا ہوا ہے۔

(۱۱۳)تو ذلیل اور خوار اس لیے ہوا کہ تو نے قرآن سے جدائی اختیار کر لی اور پھر اپنی تمام شکستوں کو زمانہ کی گردشوں کا بہانہ قرار دیا۔

(۱۱۴)تو شبنم کی طرح زمین پر پڑا ہوا ہے کیا تجھے معلوم نہیں ہے کہ تیرے بغل میں ایک زندہ کتاب یعنی قرآن بھی ہے۔

(۱۱۵)کب تک خاک کو اپنا وطن بنائے رہے گا اپنا بستر اٹھا اور آسمانوں کی تلاش میں گم ہو جا۔

علامہ اقبالؔ کی نعتیہ شاعری

نعت گوئی حضورؐ کی زندگی میں شروع ہوئی اور یہ سلسلہ آیت قرآن کے پیش نظر ''رفعنا لک ذکرک ''قیامت تک جاری رہے گا۔ حسان بن ثابت سے لے کر آج تک نعت کے میدان میں ہر نعت گو نے تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ نعتیہ مضامین میں اپنے عقیدتی اور جذباتی رنگ بھرنے کی کوشیش کی۔ نعت میں عموماً حضورؐ کے سراپا، حسن و جمال، کمال وفضائل اور آپ کے دیار سے مربوط مسائل پر زور دیا گیا۔ تقریباً تمام شعرا کے پاس یہی صورت حال نظر آتی ہے لیکن علامہ کے پاس نعتیہ مضامین میں سیرت وصفات رسولؐ، تعلیمات اسلام اور تبلیغ دین کے علاوہ عشق محمدؐ کا گہرا رنگ نظر آتا ہے جو مسلمانوں کی بگڑی بنانے کا موثر علاج تلقین کیا گیا ہے۔ علامہ سے پہلے اور علامہ کے بعد بھی کسی بھی فارسی یا اُردو شاعر کے پاس یہ کیفیت اس انداز میں موجود نہیں۔ علامہ کے فلسفہ عشق محمدیؐ میں

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست رحمت للعالمینؐ انتہا است

نعتیہ کلام میں اقبالؔ کا آہنگ جدا ہے۔ الفاظ اور ہیں سوز گداز مختلف ہے۔ اسلوب منفرد ہے عشق ومستی کے معیار اور پیمانے جو انھوں نے اپنے لئے بنائے ہیں تمام دوسرے پیمانوں سے بازی لے گئے۔

عشق دم جبرئیلؑ عشق دم مصطفیٰؐ عشق خدا کا رسولؐ عشق خدا کا کلام

طرح عشق انداز اندر جان خویش تازہ کن با مصطفیٰؐ پیمان خویش

اقبالؔ کا ذہنی ارتقا اور قلبی واردات کا اثر کچھ اتنا گہرا اور گیرا تھا کہ ان مضامین کی عکاسی اور نقاشی اتنے بھرپور انداز میں ان کے سوا اور کسی کے بس کی بات نہیں۔ کہتے ہیں۔

از مقام او اگر دور ایستی از میان محشر ما نیستی

یعنی اگر حضور کی قربت سے دوری ہو جائے تو وہ شخص ہمارے گروہ سے خارج ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔

دامنش از دست دادن مردن است چوں گل از باد خزاں افسردن است

یعنی حضورؐ کے دامن کو چھوڑنا ہلاک ہونا ہے جیسا کہ باد خزاں سے پھول مرجھاتا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے حضور اکرمؐ کو مرد کامل، نفس مطمینہ اور عبدہٗ کہہ کر عبد اور عبدہٗ کے فرق کو بڑے ہی

خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ ہم اس مقام پر چند اشعار اس مضمون پر پیش کر کے اس فلسفہ عبدہ کو واضح کریں گے۔

پیش او گیتی جبین فرسودہ است خویش را خود عبدہ فرمودہ است

یعنی اُس کے سامنے زمین سجدہ ریز ہے اگر چہ اُس نے خود اپنے آپ کو عبدہ کہا ہے۔

عبدہ از فہم تو بالا تر است آدم است وہم زآدم اقدم است

اُس کا جوہر عرب اور عجم ہونے سے نہیں بلکہ اُسکی آدمیت سے ہے جو آدم ہوتے ہوئے بھی آدمی سے افضل ہے۔

عبدہ صورت گر تقدیر ہا اندر و ویرانہ ہا تعمیر ہا

عبدہ سے تقدیریں بنتی ہیں اور ویرانے سنورتے ہیں۔

عبدہ با ابتدا بے انتہا است عبدہ را صبح و شام ما کجا است

عبدہ ابتدا سے ہے اور اسکی انتہا نہیں وہ ہماری طرح گردش چرخ میں محصور نہیں۔

کس زسر عبدہ آگاہ نیست عبدہ جز سر الا اللہ نیست

کوئی بھی سوائے خدا کے عبدہ کے راز سے واقف نہیں کیونکہ وہ خود اللہ کا راز ہے۔

لاالہ تیغ و دُم او عبدہ فاش تر خواہی بگو ہو عبدہ

لاالہ کی شمشیر کی دُم عبدہ ہے اور اگر کھلے لفظوں میں کہوں تو حق عبدہ ہے۔ عرفیؔ شیرازی نے نعت کے متعلق کہا تھا کہ یہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز راستہ ہے یہاں ذرا سی لغزش سے ثواب مورد عتاب بن سکتا ہے اور اسی باریک راہ پر اقبالؔ نے ایسی خانقاہیں بنائیں کہ جس پر رہ کر مومن مئے حُب محمدؐ سے سرشار اور مست رہتا ہے۔ اسی لئے تو عبدالسلام ندویؔ نے " اقبالؔ کامل" میں لکھا کہ "ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے عنوانات میں سب سے پُر جوش پُر سوز اور پُر درد عنوان نعتیہ شاعری کا ہے۔ سچ پوچھئے تو نعتیہ شاعری ڈاکٹر صاحب کی پوری شاعری کا خلاصہ ہے۔ روضہ رسولؐ کی زیارت کی تمنا، مدینہ کی گلیوں کو دیکھنے کا اشتیاق اور مدینہ سے دوری کا غم شعرا کا محبوب مضمون رہا ہے۔

علامہ نے بھی دیار نبیؐ کے موضوع کو اپنایا لیکن ان کا رنگ اور ان کا مقصد جذبۂ قلب کی لذت کے علاوہ امت مسلمہ کی مرکزیت' وحدت ملی کی اہمیت اور مسلمانان جہان کے لئے اس کی عظمت بن کر ظاہر ہوا۔ وہ مدینہ کو ملت اسلامیہ کا مرکز تصوّر کرتے ہیں کیونکہ رسولؐ معظم جو تمام مسلمانوں سے وابستہ ہیں مدنیہ میں مدفن ہیں۔

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است — بے خنک شہری کہ آنجا دلبر است
حلقۂ ملت محیط افزائیش — مرکز او وادیٔ بطحا ستی

مدینہ دائیرہ ملت کا مرکز ہے۔

ما ز حکم نسبت او ملیتم — اہل عالم را پیام رحمتیم

ہم ان کی نسبت کی وجہ سے ملت بنے اور انہی کے کرم سے دنیا والوں کو پیام رحمت دیتے ہیں۔

آہ یثرب مونس ہے مسلم کا تو ماوٰی ہے تو — نقطۂ جاذب تاثیر کی شعاعوں کا ہے تو
ہے اگر قومیت اسلام پابند مقام — ہندی بنیاد ہے اس کی نہ فارسی ہے نہ شام
خاتم ہستی میں تو تاباں ہے مانند نگیں — اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمین
تجھ میں راحت اس شہنشاہ معظم کو ملی — جس کے دامن میں اماں اقوام عالم کو ملی

ملت کا درد اور اس کے درمان کی طلب اقبالؔ کی نعتیہ شاعری کا خاص رنگ ہے۔ قوم کی بدبختی' بدحالی' بیکسی اور بے نوائی کا دکھڑا رنج والم درد وغم کے ساتھ میر ملت وامم کے دربار میں سوز وگداز کے لہجہ میں سُنایا جارہا ہے۔ اور ملت کی ہدایت کامرانی اور ترقی کی دعائیں مانگی جارہی ہیں۔

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر — اب تو ہی بتا تیرا مسلماں کدھر جائے
وہ لذت آشوب نہیں بحر عرب میں — پوشیدہ جو مجھ میں ہے وہ طوفاں کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روح محمدؐ — آیات الٰہی کا نگہباں کدھر جائے
کرم اے شہ عرب وعجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم — وہ گدا کے تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغ سکندری

سوز وگداز اور معانی سے لبریز نعتیہ اشعار کہنا صرف علامہ کا ہی حق معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ عبدالرحمان

جامی کے دلکش انداز کو سراہاتے ہوئے علامہ نے فرمایا تھا۔

کشتۂ اندازِ ملّا جامی ایم نظم و نثر او علاج خامی ایم

یعنی میں جامی کے انداز پر مر مٹا ہوں اور ان ہی کا کلام میرے درد کا علاج ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔

شعر لب ریز معانی گفتہ ام در ثنائے خواجہ گوہر سُفتہ ام

میں نے مطالب و معانی سے لبریز اشعار کہے ہیں اور حضورؐ کی مدح میں سچے موتیوں کی نظم تیار کی ہے۔

علامہ اقبال اپنے نعتیہ اشعار میں مسلمان کا تعلق اور اس کی وابستگی کو صرف اسلام ہی سے بتاتے ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق اسلام کی مکمل عملی تربیت بارگاہ نبویؐ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جب مولانا حسین احمد مدنی نے "ملّت از وطن است" کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کے جذبات پر ایک کاری ضرب لگانے کی کوشیش کی تو علامہ نے فوراً ان کو ٹوکا۔

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ اور نرسدی تمام بولہبی است

علامہ اقبال یہاں سعدی شیرازی کے ہم خیال ہیں۔ سعدی کہتے ہیں۔

محال است سعدی کے راہ صفا تواں رفت جز در پے مصطفیٰؐ

خلاف پیمبرؐ کسی راہ گزید کہ ہرگز بہ منزل نہ خواھد رسید

بیسویں صدی کے شروع میں جو وطنیت کی پکار اسلامی ممالک میں پھیلی ہوئی تھی اُس سے متاثر ہو کر علامہ نے فرمایا۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ ملّت کا کفن ہے

پھر اس نظم کے تسلسل کو اس طرح قائم رکھتے ہیں۔

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے غارت گر کاشانۂ دین نبویؐ ہے

بازو تیرا توحید کی قوّت سے قوی ہے اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے اے مصطفویؐ خاک میں اس بت کو ملا دے

اقبال پھر کہتے ہیں کہ قومیت کی بنیاد وطن پر نہیں بلکہ مسلک اور آئین پر ہوتی ہے اگر وطن پر ہوتی تو

حضورؐ مکّہ کو ترک نہ کرتے۔

ہے ترکِ وطن سُنّتِ محبوبؐ الٰہی　　　دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے　　　ارشادِ نبوّتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے

علامہ اقبالؔ اپنے نعتیہ اشعار میں عشقِ محمدی کو ہی اتحادِ ملی کا محور بتاتے ہیں۔ اتحادِ ملی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ۱۹۲۶ء کے میلاد النبی کے ایک جلسہ میں فرماتے ہیں۔ ''مسلمانوں کی زندگی کا راز اتحاد میں مضمر ہے۔ میں نے برسوں مطالعہ کیا راتیں غور و خوض میں گذار دیں تا کہ وہ حقیقت معلوم کروں کہ جس پر کار بند ہو کر عرب سرورِ کائناتؐ کی صحبت میں (۲۳) سال کے اندر دنیا کے امام بن گئے وہ حقیقت اتحاد و اتفاق میں ہے۔ حضورؐ اکرام کا اُسوہ حسنہ اور خُلقِ عظیم اقبالؔ کی نعتیہ شاعری کا تاج تصور کیا جاتا ہے۔ اقبالؔ حضور کی مدح سرائی کو ناممکن سمجھتے ہیں اسی لئے تو فرماتے ہیں۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب　　　گنبدِ آبگینہ رنگ ترے محیط میں حباب
شوکتِ سنجر و سلیم ترے جلال کی نمود　　　فقرِ جنید و بایزید ترا جمال بے نقاب

حضورؐ کے کردار اور خلقِ عظیم سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔

در نگاہِ او یکی بالا و پست　　　با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

حضورؐ کی نظر میں امیر و غریب صغیر و کبیر آقا اور غلام سب برابر تھے۔

حضورؐ کی تعلیمات کی وجہ سے نسلی اور نسبی امتیازات مٹ گئے۔ حضورؐ سب انسانوں کو اللہ کی مخلوق اور یکساں قرار دیتے تھے۔

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت　　　آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت

جب یمن کے قبیلہ بنی طے کو اسلامی فوجوں سے شکست ہوئی اور سردار طے کی بیٹی کو اسیر کر کے دربارِ نبویؐ میں پیش کیا گیا اور حضورؐ نے اُسے اپنی چادر سے ڈھانکا اور آزاد کر دیا۔

دخترک را چوں نبیؐ بے پردہ دید　　　چادرِ خود پیشِ روے او کشید

علامہ اقبالؔ اس حساس مقام پر مسلمانوں کی بے سروسامانی، غلامی اور افلاس کا عجیب انداز میں ذکر

کرتے ہیں جو اس نعتیہ مضمون کے اثر کو چند برابر کر دیتا ہے اور اصلاح ملّت کا باعث ہوتا ہے۔ ایسی فکر و نظر دوسرے شعرا کے نعتیہ کلام میں نظر نہیں آتی۔ اقبالؔ کہتے ہیں ہم طے قبیلہ کی اُس لڑکی سے زیادہ ننگے ہیں ہم اپنے کردار اور عمل کی وجہ سے احترام عالم کے سامنے برہنہ ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کی روز محشر حضورؐ ہی سے ہمارا اعتبار قائم ہے اور دنیا میں بھی ہماری عزّت و آبرو کا نگہبان وہی ہے۔

ما از آں خاتون طے عریاں تریم پیش اقوام جہاں بیچادر یم
روز محشر اعتبار ماست او در جہاں ہم پردہ دار ماست او

علامہ اقبالؔ حضور اکرم کے وجود رحمت کو مسلمانوں کی بقا کا ضامن قرار دیتے ہیں۔

ماند شب ھا چشم او محروم نوم تابہ تخت خسروی خوابید قوم

حضورؐ تمام رات عبادت میں جاگتے رہے اور اسی کے طفیل رحمت سے ملّت اسلامیہ تخت خسروی پر آرام سے سو سکی۔

حضورؐ ہی کی بدولت ملّت اسلامیہ ایک نقطہ اور ایک دائرہ میں جمع ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ۔

چوں گل صد برگ مارا بو یکی است او ست جان ایں نظام و او یکی است

ہم گلاب کی سو پنکھڑیوں کی طرح ہیں لیکن ہماری خوشبو ایک ہی ہے جو ہمارے معاشرے اور نظام کی جان ہے وہ بھی صرف ایک ذات برگزیدہ حضور اکرم ہے۔ جس کا لطف اور قہر دونوں بھی دنیا والوں کیلئے رحمت ہیں۔

لطف و قہر او سراپا رحمتی آں بیاراں ایں با اعدا رحمتی

علامہ اقبالؔ فنافی الرسولؐ تھے

یہ سچ ہے کہ علامہ اپنی ابتدائی عمر ہی سے عاشق رسولؐ تھے لیکن جس زمانے میں وہ فلسفہ خودی کے نشہ میں چور تھے اس موضوع پر کچھ زیادہ نہ لکھ سکے مگر آخری عمر میں جب ان کے دل میں عجیب سوز و گداز پیدا ہوا تو انھوں نے پھر نعتیہ شاعری کی طرف توجہ کی اور اس موضوع پر خصوصاً ارمغان حجاز میں بہت کچھ لکھا۔ علامہ آخری عمر میں فنافی الرسولؐ ہو گئے تھے۔ آپ کا اسم گرامی سنتے ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور اگر لیٹے ہوئے رہتے تو تڑپ کر اٹھ بیٹھتے۔ حضورؐ کا اسم گرامی زبان پر لانے سے پہلے اپنے جسم کی طہارت کے سلسلے میں اطمینان کر لیا کرتے۔ علامہ کی نعتیہ شاعری کی جان ان کا سچا عشق رسولؐ ہے جس کی بدولت ان کے کلام میں فراوانیٔ جذبات، بلندی تخیل فکر و نظر، تاثیر و اعجاز، درد و لذت اور حکیمانہ و فلسفیانہ اقدار کا بحر زخار موجیں مارتا نظر آتا ہے۔ عشق رسولؐ میں لکھا گیا ہر شعر تار رباب کی طرح درد و کرب کی موج معلوم ہوتا ہے۔ مصرع قلب و جگر کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں جنھیں اقبالؔ نے نکال کر رکھ دیے ہیں۔ یہ سب عشق محمدیؐ کا کرشمہ ہے۔ عشق اگرچہ عربی لفظ ہے لیکن قرآن و حدیث اور شعرائے جاہلیت کے کلام مین یہ لفظ نظر نہیں آتا۔ متاخرین شعرائے عرب نے بھی اس لفظ کو بہت کم استعمال کیا ہے اور عشق کی وہ اہم خصوصیات جو فارسی اور اُردو شاعری میں نظر آتی ہیں ان کا تو عربی شعرا کے کلام میں وجود ہی نہیں ہے۔ عشق کا فلسفہ اور اس کا مفہوم علامہ اقبالؔ کی شاعری میں جوش اور جذب کا مفہوم رکھتا ہے۔ علامہ نے عشق کا تصوّر مولانا رومؔ سے لیا اور مولانا رومؔ کے تصوّر عشق کا مبدا قرآن ہے۔ پروفیسر محمد فرمان لکھتے ہیں ''اقبالؔ منازل سلوک میں جذب کی راہ سے مقام فنافی الرسولؐ پر فائز تھے اور اس سلسلے میں اس مقام سے بالاتر کوئی اور مقام نہیں۔ یہیں سے عبدیت کا احساس ہوتا ہے اور عمل کی شدت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ شاعری جو ایک قوم کے قلب کو متحرک کر دے اگر بجائے خود ایک کردار و عمل ہے تو اقبالؔ کی زندگی پیہم عمل تھی''۔ اقبالؔ کے فلسفہ عشق میں عشق ہی جملہ کمالات کا منبع اور تمام فیوض اور تبرکات کا سرچشمہ ہے۔ اقبالؔ عقل کو نہیں بلکہ عشق کو امام جانتے ہیں۔ وہ عقل کو کم مایہ و ناقص اور عشق کو کامل جانتے ہیں۔

تازہ میرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا　　عشق تمام مصطفیٰؐ عقل تمام بو لہب

چناں چہ اقبالؔ اس عقیدہ پر قائم ہیں کہ عقل کو اس کے حدود میں رکھ کر عشق سے تمسک اختیار کیا جائے تاکہ منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیابی ہو۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل تھی محو تماشہ لب بام ابھی

پھر فرماتے ہیں۔

ہر کہ عشق مصطفیٰؐ سامان اوست　　بحر و بر در گوشہ دامان اوست

جو بھی عشق محمدیؐ سے سرشار ہے اس کے اختیارات کے ایک حصے میں تمام بحر و بر ہیں۔

اقبالؔ عشق کو کائنات کے جملہ اقسام کی حرکت اور ان کے صفات کی جان تصور کرتے ہیں۔ عشق کی قوت سے ہر چیز کو حاصل کیا جاسکتا ہے اور اسی سے عقیدہ اور اعتقاد کامل ہوتا ہے۔

ع۔ عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات۔

عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک　　عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

اقبالؔ کہتے ہیں مومن دنیا میں ضروریات زندگی یعنی صرف کھانے اور سونے کی بدولت زندہ نہیں بلکہ عشق محمدیؐ کی وجہ سے زندہ ہے۔

مومناں زیر سپہر لا جورد　　زندۂ عشق اند نے خواب و خورد

می ندانی عشق و مستی از کجا　　ایں شعاع آفتاب مصطفیٰؐ است

مصطفیٰؐ بحر است و موج او بلند　　خیزد ایں دریا بہ جوی خویش بلند

تو اسی کو اپنے دل میں سمو لے تاکہ اس عرق کی بدولت حضورؐ کے کمالات کی جھلک اپنے میں پیدا کر لے۔ اسی لئے تو فرمایا۔

وہ دانائے سبل ختم الرسلؐ مولائے کل جس نے　　غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر　　وہی قرآں وہی فرقاں وہی یسینؐ وہی طاہاؐ

علامہ فرماتے ہیں رسولؐ خدا کے عشق نے میرے پرسکون سینے میں ہیجان برپا کیا چناں چہ سیکڑوں نغمے

میرے سینے میں بے تاب ہیں۔

شور عشقش در نے خاموش من　　می تپد صد نغمہ در آغوش من
در تپید دم بدم آرام من　　گرم تراز صبح محشر شام من

(حضورؐ کی محبت کی حرارت سے میری راتیں روز محشر کی گرمی سے بھی ذیادہ گرم ہیں)

علامہ نے اپنے پیام میں صاف طور سے یہ بیان کیا کہ اسلام کا محور اور ایمان کا جوہر" عشق محمدیؐ " ہے۔علامہ کی شاہکار نظم "جواب شکوہ" کا ماحصل بھی " عشق محمدیؐ " ہی ہے۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے　　دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے
چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے　　رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھے
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں　　یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

علامہ نے ساری عمر مسلمانوں کو عشق رسولؐ ہی کا پیغام دیا۔اُن کا پکا یقین ہے کہ مسلمان صرف عشق رسولؐ کی بدولت ہی دنیا میں اور آخرت میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی　　نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق
عقل و دل و نگاہ کا مرشد اوّلیں ہے عشق　　عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصوّرات
عشق دم جبرئیلؑ عشق دم مصطفیؐ　　عشق خدا کا رسولؐ عشق خدا کا کلام

پھر فرماتے ہیں

طرح عشق انداز جان خویش　　تازہ کن با مصطفیؐ پیمان خویش

یعنی اپنے دل میں عشق کا بیج بو لے اور پھر سے پیمان مصطفیؐ کو تازہ کر لے کیوں کہ۔

سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا　　اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

جب علامہ اقبالؔ کو یہ پتہ چلا ہے کہ حکومت برطانیہ اپنے ناپاک قدم سرزمین پاک بطحا میں مستحکم تر کرنا چاہتے ہیں اور حجاز میں اسی بہانے سے ایک شفا خانہ بنانے کی تجویز پیش کر رہے ہیں تو اقبالؔ اس گستاخانہ حرکت کو برداشت نہیں کرتے وہ "سر" کا خطاب حاصل کر کے

ع۔ انگریز کی دہلیز پر سر ہو گئے اقبالؔ ۔ کی تہمت کو غلط ثابت کرتے ہیں اور اس تجویز کی سخت مخالفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اوروں کو دیں حضورؐ یہ پیغام زندگی میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں

جب ایک متعصب ہندو راج پال نے حضور اکرم کی شان میں گستاخانہ کتاب '' رنگیلا رسولؐ '' نشر کی اور اس کتاب کی وجہ سے برصغیر کے مسلمانوں میں غم اور غصہ کی لہر دوڑی لیکن حکومت برطانیہ نے راج پال ہی کا ساتھ دیا اُس وقت ایک نوجوان علم الدین نے راج پال کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس قتل کے اقرار پر حکومت برطانیہ نے علم الدین کو پھانسی پر چڑھا کر ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید کر دیا۔ جب راج پال کے قتل کی اطلاع اقبالؔ کو ہوئی تو علامہ نے فرمایا ''ہم پڑھے لکھوں سے تو وہ ان پڑھ ترکھان (بڑھئی) کا لڑکا کہیں زیادہ عقلمند نکلا۔ ہم بحثوں میں الجھتے رہے وہ کامیاب ہو گیا''۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب شہید علم الدین کے جنازے کا جلوس جس میں ہزاروں افراد شامل تھے علامہ کے گھر کے سامنے سے گذرا تو علامہ اپنی شدید بیماری اور کمزوری کے باوجود اس جنازے کے استقبال کے لئے اپنے گھر کے دروازے پر چند احباب کے ساتھ منتظر تھے۔ آپ نے اس بیماری کے عالم میں آگے بڑھ کر بڑی دور تک جنازے کو کاندھا دیا۔ علامہ کا چہرا سرخ تھا اور ان کی آنکھوں سے اس شہید کی کامیابی پر خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے۔ یہ تھی علامہ کی حضورؐ اور اُن سے محبت رکھنے والوں سے محبت۔ علامہ خود فرماتے ہیں۔

اصل سنت جز محبت ہیچ نیست علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست

یعنی خدا تک رسیدگی شریعت اسلام کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے اور شریعت سُنت محمدیؐ ہے اور اصل سنت جز محبت و تولا کوئی اور چیز نہیں۔ علامہ یہاں سورہ شوریٰ کی آیت '' قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربی '' کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

علامہ اسرار خودی میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ ''تمھارا محبوب کہیں باہر نہیں بلکہ تمھارے دلوں کے اندر ہی موجود ہے اور تمھاری عزت و آبرو اُسی کے نام سے قائم ہے۔

ہست معشوقی نہاں اندر دلت　　چشم اگر داری بیا بنمایت
در دل مسلم مقام مصطفیؐ است　　آبروی ما زنام مصطفیؐ است

یہ علامہ کے فنافی الرسولؐ ہونے کی دلیل تھی کہ وہ حضورؐ کا اسم گرامی لینا بھی گستاخی سمجھتے تھے اور اپنے نفس کو مزید پاکیزہ بنانا چاہتے تھے۔ اپنی مشہور مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' میں کہتے ہیں۔

چوں بنام مصطفیؐ خوانم درود　　از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ اے پابند غیر　　سینۂ تو از بتاں مانند دیر
چوں نداری از محمدؐ رنگ و بو　　از درود خود میا لا نام او

یعنی جب میں حضورؐ پر درود بھیجنا چاہا تو میں شرمندگی سے پانی پانی ہو گیا کیوں کہ عشق نے آواز دی کے تو غیر سے محبت کرتا ہے اور تیرے دل میں حضورؐ کی پاکیزگی کا کوئی رنگ یا خوشبو نہیں چناں چہ حضورؐ کا اسم عظیم اپنے ناپاک ہونٹوں سے نہ لے۔ ہم اس تحریر کو اس شعر پر ختم کرتے ہیں جو عشق رحمت للعالمینؐ کا ماحصل ہے۔

مغز قرآں ' روح ایماں ' جان دین　　ہست حُب رحمتِ للعالمینؐ

علامہ اقبالؔ اور زیارت روضۂ رسولؐ

مشہور ہے کہ ایک دن علامہ اقبالؔ کے والد مرحوم نے اقبالؔ کی دُکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پوچھا اقبالؔ؟ تم ملکوں ملکوں پھرتے رہے لیکن روضۂ اطہر پر حاضری نہ دی۔ یہ سنتے ہی اقبالؔ کی حالت غیر ہوگئی، چہرہ سرخ ہوگیا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اسی اندرونی درد و کرب کی حالت میں بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ ''وہاں کس منہ سے جاتا''؟

ہمیں اس واقعہ سے اقبالؔ کی کسر نفسی کا پتہ چلتا ہے وہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ حضورؐ کے آستانے پر حاضری دیں۔ انھیں شرم کا احساس تھا اور وہ اپنے نفس کا مزید تزکیہ کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ افسوس جب اقبالؔ اس تزکیہ نفس کی بدولت فنافی الرسول کی منزل پر پہنچے تو بوڑھے اور بڑی حد تک معذور ہو چکے تھے ان کی آنکھیں جواب دے چکیں تھیں لیکن اُس وقت بھی انھیں حضورؐ کے سامنے جانے سے شرمندگی تھی۔ آخری عمر کی وہ رباعی جو صوفی محمد رمضان کو بخش دی ان کے قلب کی صدائے برگشت ہے۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر روز محشر عذر ہائے من پذیر
در حسابم را نگیری نا گزیر از نگاہ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

(اے خدا تو دو عالم کا غنی ہے اور میں محتاج۔ حشر کے دن میرے گناہوں کو معاف کر دے اگر میرے صفحۂ اعمال دیکھنا لازمی ہو تو اُسے حضورؐ کی نظر سے بچا کر دیکھ لے)

علامہ اقبالؔ کی زندگی کے دقیق مطالعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ کو زیارت روضۂ رسولؐ کی بے انتہا آرزو تھی۔ لسان العصر اکبرالہ آبادی کو ۶/ اکتوبر ۱۹۱۱ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارت روضۂ رسولؐ نصیب کرے۔ مدّت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھئے کب جوان ہوتی ہے''۔ افسوس صد افسوس کہ اقبالؔ کی یہ آرزو نا تمام رہی۔ ع۔ اے بسا آرزو کہ خاک شود۔ جب یہ آرزو جوان ہوئی تو اقبالؔ بوڑھے اور ناتوان ہو چکے تھے چناں چہ ان کے کلام سے پتہ چلتا

ہے کہ انھوں نے ''عالم خیال'' میں آستانہ نبوی کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔

جب نیاز الدین خان نے اقبالؔ کو خط کے ذریعہ زیارت روضۂ نبویؐ سے مشرف ہونے کی سعادت کا ذکر کیا تو اقبالؔ نے لکھا ''مبارک ہو۔ اس زمانے میں یہ بڑی سعادت ہے۔ قران کثرت سے پڑھنا چاہیے تا کہ قلب محمدیؐ سے نسبت پیدا ہو۔ میرا عقیدہ ہے کہ نبیؐ کریم زندہ ہیں۔ اور اس زمانے کے لوگ بھی اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہ کرام ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقاید کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہوگا اس واسطے خاموش رہتا ہوں''

علامہ اقبالؔ کی روضۂ رسولؐ سے وابستگی اُس تحریر سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے ستمبر ۱۹۳۱ء کے خط میں گول میز کانفرس لندن جاتے ہوئے کشتی سے منشی طاہر الدین کے نام لکھی۔ لکھتے ہیں۔

''گول میز کانفرس کے ہندو اور مسلمان نمائندے شاید سات آٹھ ہیں۔ چار مسلمان نمائندے ہیں اور چاروں ''مغرب زدہ مسلمان''۔ سید علی امام کی مغرب زدگی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت عرشہ جہاز پر کھڑے تھے۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ میل و فرسنگ کا حساب کر کے کہنے لگے دیکھو بھائی اقبالؔ اس وقت ہمارا جہاز ساحل مدینہ کے سامنے گذر رہا ہے۔ یہ فقرہ ابھی پورے طور سے اُن کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت کی ان کی آنکھ نمناک ہوگئی اور بے اختیار ہو کر بولے۔ ع۔ بلغ سلامی روضۃ فیھا النبی المحترم۔ ان کے قلب کی کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔''

اسی لئے تو علامہ نے فرمایا۔

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است اے خنک شہری کہ انجا دلبر است

اقبالؔ خاک مدینہ کو دنیا اور عقبیٰ پر اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ وہاں ان کے دلبر (محمدؐ) کا مزار مبارک ہے۔ کہتے ہیں کہ ''عالم خیال'' میں علامہ نے کئی بار آستانہ محمدیؐ پر حاضری دی لیکن ہر وقت کا انداز اور رنگ جدا رہا۔ کبھی کہتے ہیں۔

فرشتے بزم رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو حضور آیۂ رحمتؐ میں لے گئے مجھ کو

علامہ کی آنکھیں کمزور ہو چکیں تھیں اور آخری عمر میں روضۂ اقدس کا شوق موجزن تھا اور اسی عالم خیال

میں کبھی سرمستانہ استغاثہ کرتے ہیں۔

تجلی ریز بر چشم ام کہ بینی بایں پیری مرا تاب نظر ہست

میری آنکھوں پر نور چمکا کر دیکھ لے کہ ابھی بڑھاپے میں میری نظر میں نور کو برداشت کرنے کی طاقت ہے۔ کبھی دل کو یوں اطمینان خاطر دیتے ہیں۔

بایں پیری رہ یثرب گرفتم نوا خواں از سرور عاشقانہ

چوں آں مرغی کہ در صحرا سرشام کشادے پر بہ فکر آشیانہ

یعنی میں نے بڑھاپے میں راہ مدینہ اختیار کیا ہے جو عشق کے نغموں کے ساتھ ہوگا میری مثال اُس پرندہ کی ہے جو سرشام صحرا میں اپنے آشیانہ جانے کے لئے پروں کو کھولتا ہے اور پرواز کرتا ہے۔

اقبالؔ کبھی عشق میں سرمست ہو کر کہتے ہیں۔

بدن وا ماند و جانم در تگ و پوست سوئے شہری کہ بطحا در رہ اوست

تو باش ایں جا و بہ خاصاں بیا میز کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یعنی بدن تو رہ گیا لیکن روح مدینہ کے سفر پر نکل گئی۔ تو یہاں پر خاص لوگوں سے ملتا رہ مجھے تو اب اپنے دوست (حضور اکرم) کے گھر جانا ہے۔

مولانا غلام بھیک نیرنگ لکھتے ہیں کہ ''اقبالؔ کا قلبی تعلق حضور سرور کائنات کی ذات اقدس سے اسقدر نازک تھا کہ حضورؐ کا ذکر آتے ہی ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی چونکہ میں بارہا ان کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا اس لئے میں نے ان کے سامنے تو نہیں کہا مگر خاص لوگوں میں بطور راز ضرور کہا کہ اگر یہ حضورؐ کے مرقد پر حاضر ہوں گے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے بلکہ وہیں جان بحق ہو جائیں گے۔''

قصیدہ بردہ ۔ بوصیری اور علامہ اقبالؔ

تاریخ نعت میں دو نعتیہ قصیدے ' اور تین نعت گو شاعر مشہور ہوئے ہیں جن کو حضورؐ اکرم سے خاص نسبت حاصل رہی ہے۔ قصیدہ ''بانت سعاد'' جس کو قصیدہ بردہ یعنی قصیدہ چادر بھی کہتے ہیں جناب کعب بن زہیر کا ہے۔ جناب کعب بن زہیر زمانہ جاہلیت کے ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے تھے جنھوں نے پہلے پیغمبر اسلامؐ کی شان میں گستاخانہ اور توہین آمیز اشعار کہے لیکن بعد میں اپنے کئے پر نادم ہو کر رحمت العالمینؐ سے معافی طلب کر کے حضورؐ کی شان میں نعتیہ قصیدہ بانت سعاد پڑھا جس کے ایک شعر پر حضورؐ نے اصلاح کرتے ہوئے کعب کو اپنی ردائے مبارک عطا کی جس سے اُن کا لقب شاعرِ چادر رحمت ہو گیا۔ یہ ردا آج بھی ترکی میں (TOPKOPI) میں محفوظ ہے۔ ایک شعر میں جو حضورؐ نے تصحیح فرمائی وہ ''سیف الھند'' کی جگہ ''سیف اللہ'' ہے۔ یعنی رسولؐ خدا ھند کی تلوار نہیں بلکہ خدا کی تلواروں میں سے ایک چمکدار اور آبدار تلوار ہیں جن سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ دوسرا مشہور ''قصیدہ الکواکب السعدیہ فی مدح خیر البریہ'' یا قصیدہ میمیہ ہے جو قصیدہ بردہ شریف کے نام سے مشہور ہے جسے شرف الدین ابو عبداللہ محمدؐ بن سعید بوصیری نے لکھا ہے۔

علامہ بوصیری ۶۰۸ ہجری میں مصر کے ایک گاؤں بوصیر میں پیدا ہوئے اور (۸۸) سال کی عمر بسر کر کے ۶۹۶ ہجری میں داعی اجل کو لبیک کہا ۔ یہ قصیدہ بردہ ' قصیدہ بانت سعاد کے تقریباً (۶۵۰) سال بعد لکھا گیا ہے۔ مختلف مستند حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بوصیری فالج کے حملہ سے مفلوج ہو چکے تھے چنانچہ برص اور جذام کی بیماری کی روایت ضعیف ہے۔ جب فالج کا کوئی علاج کارگر ثابت نہ ہوا تو بوصیری نے حضور اکرمؐ کی بارگاہ میں قصیدہ لکھا۔ اُسی رات خواب میں حضور اکرمؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حضورؐ کو یہ قصیدہ سُنایا۔ حضورؐ نے خوش ہو کر آپ کے بدن پر اپنا دست مبارک پھیرا اور بوصیری پر اپنی چادر اوڑھائی ۔ جب آنکھ کھلی تو بوصیری مکمل صحت یاب تھے۔ صبح کو بغیر سہارے کے چلتا ہوا دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوا۔ راستے میں قطب زماں شیخ ابوالرجا ملے انھوں نے علامہ بوصیری سے قصیدہ کا مطلع پڑھ کر وہی قصیدہ سُنانے کی درخواست کی جو انھوں نے حضور اکرمؐ

کو گذشتہ شب عالم خواب میں سنایا تھا۔ تمام لوگ یہ سن کر حیرت میں پڑ گئے کیونکہ بوصیری نے اس قصیدہ کو ابھی تک لوگوں کو نہیں سُنایا تھا اور نہ اس واقعہ کو بیان کیا تھا۔ اُس وقت سے یہ قصیدہ حضورؐ کی عطا کی گئی چادر کی نسبت سے قصیدہ بردہ ہی کہلاتا ہے۔ یہ قصیدہ (۱۶۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ قصیدہ رفع ودفع بلا اور حلاّل المشکلات مانا جاتا ہے اس میں حضورؐ کے فضائل خصائل شمائل مناقب معجزات اور ولائے محمدیؐ کے مضامین بھرے پڑے ہیں اس موقع پر اس بات کا انکشاف بھی بے محل نہیں کہ سب سے عظیم نعت گو شاعر جنھیں حضورؐ نے منبر پر بٹھا کر نعت سنی حسانؓ بن ثابت ہیں جنھیں شاعر دربار رسالت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے ان کے متعلق گفتگو اور ان کے نعتیہ کلام پر تاریخ نعت گوئی میں کافی ذخیرے موجود ہیں۔

علامہ اقبالؔ نے اپنے فارسی کلام میں کعب بن زھیر کا ایک بار اور علامہ بوصیری کا دو بار تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کے خطوط میں اسکا ذکر بھی کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضورؐ نے ان دو شاعروں یعنی کعب بن زھیر کو اپنی زندگی میں تمام اصحاب کے سامنے اور علامہ بوصیری کو حالت خواب میں کئی صدیوں کے گذر جانے کے بعد چادر رحمت عطا کر کے روحی اور بدنی بیماریوں سے نجات دے کر وہ مقام عطا کیا جو آج تک کسی کو حاصل نہیں چنانچہ شاید اسی لیے علامہ اقبالؔ نے بھی ان افراد کا حوالہ دیتے ہوئے حضورؐ سے شفایابی کی دعا کی ہوگی۔

رموز بے خودی کی (۳۸) اشعار پر مشتمل مثنوی بعنوان ملّت محمدؐیہ توحید اور رسالتؐ ہے کے ذیل میں علامہ کعب بن زھیر کے قصیدہ بانت سعاد کی بابت لکھتے ہیں۔

پیش پیغمبرؐ چو کعب پاک زاد　　ھدیہ ئی آورد از بانت سُعاد

در ثنایش گوہر شب تاب سفت　　سیف مسلول از سیوف الھند گفت

گفت سیف من سیوف اللہ گو　　حق پرستی جز براہ حق مپو

(ترجمہ) کعب پاک ذات نے حضورؐ کی خدمت میں قصیدہ بانت سعاد کا تحفہ پیش کیا جو آپ کی ثنا میں موتیوں کے ہار کی مانند درخشاں تھا جس میں حضورؐ کو ھند کی شمشیر بتلایا۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

مجھے سیف خدا کہو اور ہمیشہ حق کی پرستش کرو اور غیر از حق کسی دوسری راہ پر قدم مت بڑھاؤ۔

جہاں تک جناب بوصیری کے تذکرے کا تعلق ہے علامہ اقبال نے دو بار ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک بار ۱۹۱۸ء کے رموز بیخودی میں بعنوان " عرض حال مصنف بحضورؐ رحمت العالمینؐ " ہے دوسرا ذکر ۳/اپریل ۱۹۳۶ء کو بھوپال میں سرسید احمد خان کہ خواب میں دیکھنے کے بعد اور سرسید کی تاکید پر اپنی بیماری کے لئے حضورؐ کی شفا طلب کرنے کی ہدایت پر ملتا ہے۔

رموز بے خودی میں (۶۵) اشعار کی مثنوی کے ۲۴ ویں شعر میں فرمایا

ای بصیری را ردا بخشندہ ئی　　بربط سلما مرا بخشندہ ئی

ذوق حق دہ این خطا اندیش را　　اینکہ نشناسد متاع خویش را

(ترجمہ) اے بصیری کو چادر بخشنے والے مجھے بھی بربط سلما عطا کر۔ جستجوئے حق کا شوق اس خطا کار کو دے جو اپنی متاع کو ابھی تک نہیں پہچانتا ہے۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال کے بیان کے مطابق علامہ جوانی ہی سے ضعیفی چشم اور دوسری بدنی کسالتوں سے دوچار تھے مگر کلیوی اور حلق وگلو کی بیماریاں ان کی زندگی کے آخری آٹھ سالوں میں شدت سے ظاہر ہونے لگیں تھی۔ اِس مثنوی میں علامہ نے اپنی بدنی شفا کا ذکر نہیں کیا بلکہ اپنی روح کی تقویت اور پاکیزگی کی دعا کی ہے۔ اسی مثنوی میں مسلمانوں کی شکستہ حالی اور ان کی گرتی ہوئی روحانی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مسلم از سر نبیؐ بیگانہ شد　　باز این بیت الحرم بت خانہ شد

شیخ ما از برہمن کافر تر است　　زانکہ او را سومنات اندر سر است

یعنی مسلمان اسرار نبیؐ سے بیگانہ ہو گئے ہیں اور پھر کعبہ بت خانہ بن گیا ہے۔ ہمارا شیخ برہمن سے بھی بڑا کافر ہے کیونکہ سومنات ہمارے شیخ کے سر کے اندر ہے جبکہ برہمن کا سومنات اُس کے بدن سے باہر ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے خط ۲۹/جون ۱۹۳۶ء میں سر راس مسعود کو لکھا کی ۳/اپریل ۱۹۳۶ء جب میں بھوپال میں تھا آپ کے جد سرسید احمد خان کو خواب میں دیکھا کہ مجھ سے کہہ رہے تھے اپنی بیماری کو

حضورؐ کی خدمت میں عرض کرو چنانچہ جیسے ہی خواب سے بیدار ہوا میں نے چند اشعار زبان فارسی میں لکھے اور اب لاہور پہنچا تو اُس کو ایک مثنوی کی شکل میں ترتیب دے کر اس کا نام ''پس چہ باید کرد ای اقوام شرق'' رکھا ہے (مکتوبات اقبال۔ بھوپال صفحہ ۶۵۔ اخلاق اثر) اس مثنوی کے آخری (۶۲) اشعار بعنوان ''در حضورؐ رسالت مآب'' میں پانچ اشعار اقبال اپنی بیماری اور دوا خوری کے بارے لکھتے ہیں اور حضورؐ سے بوصیری کا واسطہ دے کر شفا طلب کرتے ہیں۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اقبال کی بیماری کے عنوان کے ذیل میں لکھا کہ علامہ چھوٹے بچوں کی طرح کڑوی اور تلخ دواؤں سے گھبراتے تھے اور انہیں استعمال نہیں کرتے تھے۔ اقبال فرماتے ہیں۔

کار این بیمار نتوان برد پیش　　من چو طفلان نالم از داروئ خویش
در نسازد با دوا ها جان زار　　تلخ و بویش برمشا میم ناگوار

اقبالؔ اور عشقِ علی علیہ سلام

کسی بھی شاعر کا کلام اُسکی فکر و تخیل، علم و دانش اور شعریت کا آئینہ ہوتا ہے یعنی شعر بڑی حد تک شاعر کی شخصیت کی تفسیر اور اُسکے جذبات کی تصویر ہوتا ہے۔ نظریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ اقبالؔ کے کلام میں عشقِ حضرت علی علیہ السلام کی قدروں کے مطالعہ سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ علامہ سچے اور حقیقی عاشق علی علیہ السلام تھے۔

شاعر مشرق علامہ اقبالؔ نے قرآنی تفاسیر کے ساتھ ساتھ احادیث نبویؐ اور تاریخ اسلامی کا بہ تحقیق مطالعہ کیا اور انہی گراں قدر علوم کے ذریعہ راہِ حق دریافت کیا چنانچہ علامہ نے ابتدائی دینی تعلیم مولوی میر حسن صاحب سے حاصل کی جو آپکے عربی اور فارسی کے اُستاد بھی رہے پھر اپنی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کیلیئے اسلامیات کے ساتھ ساتھ فارسی کے عظیم شعراء کے کلام سے مستفید ہوئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں علامہ حضورؐ سرورِ مرتبت سے والہانہ محبت رکھتے تھے وہاں بے پناہ عشق حضرت علیؑ کی ذات سے بھی کرتے تھے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت علیؑ نے نصرت و حفاظت اور محبت رسولؐ پر اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو قربان کر دیا تھا خود فرماتے ہیں۔

ہیچ کس رازی کہ من گویم نگفت ہمچو فکر من دُرِ معنی نہ سفت

(کسی نے بھی میری طرح گراں قدر راز و رموز بیان نہیں کیے اور نہ کسی فکر نے میری طرح معنوی موتی پروئے)

اس خصوصی تحریر میں تمام تر کوشش یہی کی گئی ہے کہ اقبالؔ اور عشقِ علیؑ کا موضوع اُنہی کے کلام کے ذریعہ روشن ہو سکے تا کہ قارئین پر یہ واضح ہو سکے کہ اقبالیات میں اسلام کا مرکز اور ایمان کا محور عشقِ محمدؐ اور عشقِ علیؑ ہی تھا۔

اگر چہ صدہا اشعار اُردو اور فارسی میں کلیاتِ اقبالؔ میں موجود ہیں لیکن مضمون کے عنوان اور اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف چند اشعار جو حضرت علیؑ کی ذات گرامی سے وابستہ ہیں پیش کیے گئے ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے فارسی مثنوی اسرار خودی میں ایک (۵۹) اشعار کی نظم " حضرت علیؑ کے

ناموں کے اسرار کی تشریح'' کے عنوان کے تحت لکھ کر حضرت علیؑ کے بارہ سے زیادہ نام، کنیات خطابات اور القاب کی تشریح بڑے دلکش انداز میں کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کو دعوت فکر دیتے ہوئے فرمایا۔

ھر کہ دانائے رموز زندگی ست سرِّ اسمائے علیؑ داند کہ چیست

(اُس شخص نے زندگی کے تمام رازوں کو پہچان لیا ہے جس نے حضرت علیؑ کے ناموں کے اسباب اور رازوں کو جان لیا ہے)

مسلم اوّل شہ مرداں علیؑ عشق را سرمایۂ ایماں علیؑ

اس شعر میں علامہ نے حضرت علیؑ کی تین بڑی فضیلتیں جو دیگر مسلمانوں کو میسر نہ ہو سکیں بیان کی ہیں۔ پہلی فضیلت حضرت علیؑ سب سے پہلے مسلمان تھے۔ ابو حازم اور زین بن ارقم سے مروی ہے کہ ''علیؑ اول من اسلم''، یعنی علیؑ نے سب سے پہلے دعوت اسلام پر لبیک کہا۔ حضرت علیؑ کی دوسری فضیلت وہ مردوں کے شاہ قرار پائے چنانچہ تاریخیں گواہ ہیں کہ بدر، احد، خندق، خیبر اور دیگر غزوات میں آپ ہی کی شجاعت نے اسلام کی لاج رکھ لی اور آپ ہی کی تلوار ذوالفقار ہی نے جو فلک سے آپ پر اُتری تھی دشمنان اسلام کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ تیسری فضیلت حضرت علیؑ کی محبت ہے جو ایمان کا اساس اور سرمایہ رہی کیونکہ آپ نے ہمیشہ حضور اکرمؐ کے پسینۂ پر اپنا خون بہانا پسند کیا اور شب ہجرت بستر رسولؐ پر سو کر پیغمبرؐ کی جان بچائی اور اس طرح اپنا نفس خوشنودی خدا میں فروخت کر کے ہدایت خدا حاصل کی۔ اس پر آپ فرماتے ہیں۔

مرسلؐ حق کرد نامش بو ترابؑ حق یداللہ خواند در اُمّ الکتاب

مرتضیٰؑ کز تیغ او حق روشن ست بو ترابؑ از فتح اقلیم تن است

حضرت رسولؐ کریمؐ نے علیؑ کو ابوتراب ''مٹی کا باپ'' کی کنیت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت علیؑ اس لئے بوترابؑ ہوئے کہ آپ اپنے سفالی بدن کی خواہشات، نفس امارہ پر مکمل قابو کر کے ''نفس مطمئنہ'' ہو گئے تھے۔ علامہ فرماتے ہیں خداوندِ عالم نے حضرت علیؑ کو سورہ الفتح میں ''یداللہ'' خدا کا ہاتھ قرار

دیا کیوں کہ آپ نے اپنی رضا اور مرضی کو رضائے خدا کے سپرد کر دیا تھا۔

آپ مرتضیٰ یعنی ''منتخب و پسندیدہ'' اس لئے ہیں کہ آپ کی تلوار اور آپ کے جہاد نے باطل کو مٹا کر حق کا بول بالا کیا۔

زیر پاش اینجاہ شکوہ خیبر است　　　　دست او آنجا قسیم کوثر است

(حضرت علیؑ نے دنیا میں فاتح خیبر ہونیکا شرف پایا تو دوسری طرف عرش پر کوثر کو تقسیم کرنے والے کی فضیلت سے ہمکنار ہوں گے)

ذات او دروازئی شہر علوم　　　　زیر فرمانش حجاز وچین وروم

مرد کشور گیر از کرازی است　　　　گو ھرش را آبرو خود داری است

علامہ مشہور حدیث پیغمبرؐ ''انا مدینۃ علم وعلی بابھا'' یعنی میں شہر علم ہوں اور علیؑ اُسکا دروازہ ہیں، کی طرف اشارہ کرر ہے ہیں۔ حضرت علیؑ کے خطاب ''کرّار'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انسان کو اُس وقت تک کامیابی اور فتح حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ وہ آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ آور نہ ہو، جس طرح سے علیؑ نے علم حاصل کر کے قلعہ خیبر فتح کیا تھا۔ علامہ فرماتے ہیں۔

ھر کہ در آفاق گردد بو ترابؑ　　　　باز گر داند ز مغرب آفتاب

(آپ کا معجزہ ردالشمس کا اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں جو شخص اس دنیا میں بوترابؑ ہونے کا لقب حاصل کرتا ہے وہی گردش آفتاب کو مغرب سے پلٹ سکتا ہے) علامہ اقبالؔ کو حضرت علیؑ سے بے پناہ محبت تھی اور اِسی عشق کو وہ اپنی کامیابی اور پیروزی کا راز سمجھتے تھے چنانچہ ایک غزل میں کہتے ہیں۔

یہ ہے اقبالؔ فیض یاد نام مرتضیٰؑ جس سے　　　　نگاہ فکر ہیں خلوت سرائے لامکاں تک ہے

ایک اور موقع پر اسرار خودی میں یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں۔

از ولائے دود مانش زندہ ام　　　　در جھاں مثل گہر تابندہ ام

(یعنی حضرت علیؑ کے عالی خاندان کی الفت اور محبت سے زندہ ہوں اور اِسی محبت و الفت کے باعث سارے عالم میں میری شہرت کی روشنی ہے)

زمزم ار جوشد زخاک من از اوست　　مئے اگر ریزد زتاک من از اوست

(یعنی چونکہ حضرت علیؑ علم وحکمت ودانش کا سمندر ہیں اس لئے علامہ کی فکر سے ابلتے ہوئے چشمے اور چھلکتی ہوئی معرفت کی شراب کا منبع ذات مولا علیؑ ہی ہے) ایک اور مقام پر بانگ درا میں "میں اور تو" کے ذیل میں کہتے ہیں۔

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر وغنا نہ کر　　کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدریؑ

نہ ستیز گاہ جہان نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے　　وہی فطرت اسدؑ اللہی وہی مرحبی وہی عنتری

ضرب کلیم میں ارشاد فرماتے ہیں۔

مرے لئے فقط زور حیدریؑ کافی　　ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک

بے جرات رندانہ ہر عشق ہے روباہی　　بازو ہے قوی جس کا وہ عشق ید الٰہی

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی　　کہ اس کے فقر میں ہے حیدریؑ و کرّاری

پھر فرماتے ہیں۔

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل　　نہ زور حیدریؑ تجھ میں نہ استغنائے سلمانیؑ

اسرار خودی میں کہتے ہیں۔

نعرۂ حیدرؑ نوائے بوذر است　　گرچہ از حلقِ بلالؓ و قنبر است

ایک اور مقام پر جاوید نامہ میں کہتے ہیں۔

پیش اُو نہ آسمان نہ خیبر است　　ضربت او از مقام حیدرؑ است

جاوید نامہ میں اجنبی تعلیم وتربیت کو غارت گری اور قوت حیدریؑ نہ ہونیکی وجہ سے دیر قلعہ خیبر کی شکل میں بدل گئے ہیں بتاتے ہیں۔

دانش افرنگیاں غارت گری　　دیرہا خیبر شد از بی حیدری

اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ کی دعوت کا سفر کرتے ہوئے "مسافر نامہ" میں ارشاد کرتے ہیں۔

می شناسی معنی کرارؑ چیست　　ایں مقامی از مقاماتِ علیؑ ست

مومناں را در زمانِ بی ثبات نیست ممکن جز بہ کراری حیات
مسلم ھندی چرا ۔میداں گذاشت ھمت او بوی کراری نداشت

(یعنی جانتے ہو کرار کے معنی کیا ہیں۔ یہ مقام فضیلت علیؑ کے فضائل کا ایک جز ہے۔ اس دارِ فانی کی اُمتیں بغیر کراری کے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں سے میداں اس لئے چھوٹا کہ ان کی ہمت میں کراری کی خوبُو موجود نہ تھی۔)

کبھی بال جبرئیل میں عشق علیؑ میں مست ہو کر فرماتے ہیں۔

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق کبھی سوز و سرور انجمن عشق
کبھی سرمایہ محراب و منبر کبھی مولا علیؑ خیبر شکن عشق
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی

جاوید نامہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

عشق بانانِ جویں خیبر کشاد عشق در اندام مہ چاکی نہاد

(یعنی یہ عشقِ الٰہی تھا جس کی قوت نے دروازہ خیبر اکھاڑا جسکی غذا جو کی روٹی تھی اور جس کے اشارہ پر چاند کے بدن میں شگاف ہوا)۔ علامہ اقبال کی ایک خاص مناجات "سپاس امیرؑ" جسے وہ ہر روز بعد نماز فجر کے پڑھا کرتے تھے اور جو جنوری ۱۹۰۵ء میں مجلہ مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ اسکے (۳۴) اشعار میں سے صرف چند شعر پیش کئے جا رہے ہیں۔

اے باب مدینہ محبت اے نوحؑ سفینہ محبت
اے تر خط وجوب امکان ۔ تفسیر تو سورہائے قرآن
اے سرِ نبوت محمدؐ اے وصف تو مدحت محمدؐ
بے تو نتواں با او رسیدن بے او نتواں بتو رسیدن
از ہوش شدم مگر بہ ہوشم گوئی کہ نصیریٔ خموشم
امّا چہ کنم مے تولا تُند است بروں فتد زمینا

زاندیشہ عاقبت رھیدم جنس غم آل تو خریدم

(اے شہر محبت کے دروازے، اے محبت کے سفینہ کے ناخدا، اے معبود اور عبد کے درمیانی رشتے اے قرآنی سورتوں کی تفسیر، اے رازدار نبوت محمدؐ جسکی روح، روح محمدؐ ہے۔ تیرے بغیر (علیؑ) محمدؐ تک نہیں جاسکتے اور اُسکے (محمدؐ) کے بغیر (علیؑ) تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں ہوش کی زیادتی سے بیہوش ہو گیا ہوں، یعنی یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک خاموش نصیری کی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں۔ کیا کروں کہ تیری محبت کی شراب اتنی تیز اور دو آتشہ ہے کہ میرے دل کی صراحی سے چھلک چھلک کر گر رہی ہے۔ مجھے اب آخرت کی کوئی فکر نہیں ہے کیونکہ میں نے تیری (علیؑ) اولاد کی محبت اور اُن کی اطاعت کو آخرت کا اثاثہ سمجھ کر خرید رکھا ہے)۔

مسلمانوں کے حق میں دعا کرتے ہوئے بال جبرئیل میں ارشاد فرماتے ہیں۔

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے اُسے بازوی حیدرؑ بھی عطا کر
بڑھ کر خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن اِس زمانے میں کوئی حیدرؑ کرار بھی ہے

آخر میں نمونہ کے طور پر صرف چند اشعار جو علامہ اقبالؔ کے خصوصی عشق علیؑ کا سراغ دیتے ہیں ملاحظہ فرمایئے۔

فیض اقبالؔ ہے اُسی در کا بندۂ شاہِ لافتیٰؑ ہوں میں (فریاد امت)
کرم کرم کہ غریب دیار ہے اقبالؔ مرید پیر نجفؑ ہے غلام ہے تیرا (التجائے مسافر)
دل میں ہے مجھ بے عمل کہ داغ عشق اہلبیتؑ ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِ دامنِ حیدرؑ مجھے
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

منقبت حضرت فاطمہؑ ۔ اقبال کی قلبی واردات

علامہ اقبال نے ۱۹۱۷ء میں رموز بے خودی میں فاطمہ زہرا " تمام مسلمان عورتوں کے لیے اُسوہ کاملہ ہیں کے عنوان کے تحت ایک (۱۹) اشعار کی منقبت لکھی جو ایک شاہکار تخلیق تصور کی جاتی ہے۔ علامہ بڑی دیدہ ریزی اور مشکل پسندی سے اہلبیت کرامؑ کی مدح کرتے تھے اور ان موضوعات پر قلم اٹھاتے وقت دوسرے اساتذہ سخن کے مشوروں اور رہنمایوں سے بہرہ مند بھی ہوتے تھے۔ اس چھوٹی سی (۱۹) اشعار کی نظم پر علامہ نے چھ ہفتوں سے زیادہ فکر و غور کیا۔ علامہ کے پانچ خطوط مولانا گرامی کے نام اس مضمون پر ہیں جو ہمارے بیان کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

مولانا عبدالقادر گرامی جالندھری سے علامہ اقبال کے تعلقات ۱۹۰۲ء سے برقرار تھے وہ ۱۹۱۷ء تک حیدرآباد دکن کے شاہی دربار سے منسلک رہے اور ملک الشعرا قرار پائے۔ آخری عمر میں ہوشیار پور آ گئے جہاں ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ محمد عبدالقریشی نے مکاتب اقبال بنام گرامی کے عنوان سے اُن کے (۹۰) خطوط شائع کیے ہیں۔

علامہ اقبال ۱۸ جون ۱۹۱۷ء کو مولانا گرامی کے خط میں لکھتے ہیں کہ آج کل فاطمہ زہراؑ کا مضمون زیر نظر ہے۔ دو شعر لکھے تھے جو ذیل میں عرض کرتا ہوں۔ بہ نظر اصلاح اور رائے سے آگاہ کیجئے۔

بہر محتاجی دلش آنگونہ سوخت   با یہودی چادر خود را فروخت
محنت ش پر ور دۂ صبرو رضا   آسیا گردان و لب قرآن سرا

دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ کھٹکتا ہے۔

چونکہ مولانا گرامی کے خطوط جو اُنھوں نے اقبال کو لکھے ہمارے دسترس سے خارج ہیں اور ہمارے درمیان موجود نہیں اس لئے ہم صرف قیاس کر سکتے ہیں کہ دوسرے شعر کا پہلا لفظ محنتش کو گرامی نے ''آن ادب'' کر دیا ہوگا کیوں کہ نظم میں اب شعر یوں ہے۔

آن ادب پروردۂ صبر و رضا   آسیا گردان و لب قرآن سرا

(یعنی وہ ادب، صبر اور رضا کی آغوش کی پلی تھی جو چکی پیستے وقت بھی قرآن کی تلاوت میں مشغول

رہتی تھی)۔ علامہ یکم جولائی ۱۹۱۷ء کے خط میں مولانا گرامی کو لکھتے ہیں البتہ مریم کو فاطمہ زہراؑ کے متعلق ایک نسبت حاصل تھی یہ کہ وہ مسیح کی ماں تھی لیکن فاطمہؑ تین نسبتوں سے محترم ہیں ۔

مریمؑ از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز — از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز
نور چشم رحمت العالمینؐ — آن امام اولین وآخرین
آنکہ جان در پیکر گیتی دمید — روزگار تازہ آئین آفرید
بانوی آن تاجدار ھل اتی — مرتضیٰؑ مشکل کشا شیر خداؑ
پادشاہ و کلبۂ ایوان او — یک حسام ویک زرہ سامان او
مادر آں کارواں سالار عشق — رونق ہنگامہ بازار عشق (یہ مصرع کھٹکتا ہے)

(ترجمہ "اگر مریم کی نسبت مادر عیسیٰؑ ہونیکی وجہ سے محترم ہے تو حضرت فاطمہؑ تین نسبتوں سے محترم ہیں۔ فاطمہؑ رحمت للعالمینؐ کی نور چشمی ہیں جو اولین اور آخرین امام ہیں۔ جن کی بدولت دنیا نئی اور خلق کی گئی۔ فاطمہؑ ان کی ہمسر ہے جن کے سر پر ھل اتی کا تاج ہے جو مرتضیٰؑ مشکل کشا اور شیرؑ خدا ہے جو ایسا بادشاہ تھا کہ اس کا چھوٹا سا گھر اسکا ایوان تھا اور ایک تلوار اور زرہ اس کا سامان تھا۔ فاطمہؑ عشق کے کارواں کے سالار کی ماں ہے جو بازار عشق کے ہنگامے کی رونق تھا۔)

علامہ اقبالؔ کے خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کی گرامیؔ نے بتایا کہ دونوں مصرعوں میں آخری شعر کے "مادر" آنا چاہیے چنانچہ اقبالؔ نے آخری شعر یوں کر دیا ۔

مادر آن مرکز پرکار عشق — مادر آں کارواں سالار عشق

علامہ اقبالؔ اپنے تیسرے خط بنام مولانا گرامیؔ ۳ جولائی ۱۹۱۷ء میں لکھتے ہیں "میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ میں فکر میں ہوں کہ حضرت سیدہ کے متعلق ایک ایسا شعر لکھا جائے جو معنی کے اعتبار سے ایک سو شعر کے برابر ہو۔ آج صبح آنکھ کھلتے ہی وہ شعر ذہن میں آیا ابھی اسے خراد کی ضرورت ہے۔ عرض کرتا ہوں۔

گریۂ شب ہائے آن بالا نشین — ہم چو شبنم ریخت بر عرش برین

اس شعر کو بہ نظر غور ملاحظہ فرمائے۔ ''بالانشین'' ''ریختن'' کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے مگر کسی قدر کھٹکتا ہے''۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا گرامی کے مشورے سے اقبال نے اس موضوع کو دو شعروں میں بیان کیا اور پہلے مصرع میں بھی تبدیلی کی۔

گریہ ہائی او زبالین بے نیاز　　گوہر افشاندی بدامان نماز
اشک او بر چید جبریلؑ از زمین　　ہمچو شبنم ریخت بر عرش برین

ترجمہ۔ اُس کے بے نیاز گریہ میں جو آنسو گوہر کی طرح نماز کی حالت میں اُس کے دامن اور زمین پر گرتے رہے اُسے جبریل نے چنا اور شبنم کے مانند عرش بریں پر بکھیر دیے۔

علامہ اقبال پھر ۶ جولائی کو مولانا گرامی کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''آپ نے جو ترمیم کی وہ بہت بلند ہے بہر حال میں اسے سمجھتا ہوں اور چوں کہ آپ نے پیدا کیا ہے اس کی داد دیتا ہوں۔ چونکہ فاطمہؑ کے متعلق اشعار نظم کر رہا ہوں کیا آپ کو کوئی عمدہ روایت اُن کی طاعت گذاری یا تربیت اولاد کے متعلق یاد ہے جس کو نظم کیا جائے۔ معنی خیز گداز روایت ہو تو نظم کرنے میں لطف آتا ہے''۔

علامہ اقبال کا آخری خط اِس ذیل میں ۱۶ جولائی ۱۹۱۷ کا ہے جس میں مولانا گرامی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ ''ہاں فاطمہؑ کے متعلق جو اشعار میں نے لکھے تھے اُس کے آخر کے اشعار اس طرح سے ہیں۔

مادر آن مرکز پرگار عشق　　مادر آں کاروان سالار عشق
آں یکی شمع شبستان حرم　　حافظ جمعیت خیر الاممؐ
تا نشیند آتش پیکار و کین　　پشت پا زد بر سر تاج و نگین
در نوای زندگی سوز از حسینؑ　　اہل حق حریت آموز از حسینؑ
سیرت فرزندها از امہات　　جوہر صدق و صفا از امہات
مزرع تسلیم را حاصل بتولؑ　　مادران را اسوہ ای کامل بتولؑ

(ترجمہ ۔ فاطمہؑ مرکز پرگار عشق اور کاروان سالار عشق کی ماں ہے۔ ایک بیٹا حرم کے شبستان کی شمع

جمعیت خیر الامم کا محافظ جس نے تخت و تاج کو ٹھوکر پر مارا۔ زندگی کے نغمہ میں سوز و گداز حسینؓ سے ہے اہل حق کے لئے حسینؓ درس آزادی ہے۔ اولاد کی سیرت نگاری اور اُن کی صدق و صفا کے جوہر کی نشوونما ماں سے ہے۔ اسلام کی کشت کا ثمر فاطمہؓ ہے اور فاطمہؓ کی زندگی مادران کے لئے اسوہ کامل اور اسوہ حسنہ ہے)

اقبالؔ ۱۶ر جولائی ۱۹۱۷ کے خط میں ان اشعار کو لکھنے کے بعد کہتے ہیں ''آپ نے لکھا تھا کہ دونوں مصرعوں میں ''مادر'' کا لفظ ہونا چاہیے۔ معلوم نہیں آپ کے ذہن میں کیا نکتہ تھا جس کے بیان کرنے کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔ میں نے اس اشارے سے فایدہ اٹھایا ہے کہ بعد کے شعر میں حسنؓ و حسینؓ دونوں کا ذکر کر دیا ہے۔ اب ان اشعار کے بعد کا مضمون یہ ہے کہ ایسے بیٹوں سے جن کے یہ اوصاف ہیں ماں کی تربیت کا اندازہ کرنا چاہئے تا کہ معلوم ہو کہ اس ماں کی آغوش میں کیا تاثیر تھی جس میں ایسے بچوں کی پرورش ہوئی''۔

علامہ اقبالؔ نے اس نظم کو ان آخری دو اشعار پر ختم کیا۔

رشتہ ئی آئین حق زنجیر پاست　　پاس فرمان جناب مصطفیٰؐ است
ورنہ گرد تربتش گردید مے　　سجدہ ھا بر خاک او پا شید مے

یعنی اسلام کے آئین کی زنجیر میرے پاؤں میں ہے اور شریعت محمدی کا خیال بھی ہے ورنہ میں فاطمہؓ کی قبر کے طواف میں زندگی بسر کر دیتا اور اُن کی قبر پر تمام عمر سجدے نچھاور کرتا رہتا۔

اقبالؔ عاشقِ امام حسینؑ علیہ السلام

شاعر مشرق، ڈاکٹر محمدؒ اقبالؔ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام سے والہانہ عشق و محبت رکھتے تھے اور آپ کی حیات طیبہ کو انسانی زندگی کی معراج اور آپ کی عظیم قربانی کو نوع انسانی کیلئے ایک درسِ آزادی اور مسلمانوں کیلئے ایک کامل اُسوہ حسنہ اور مشکلات زندگی کا مکمل حل تسلیم کرتے تھے۔ علامہ اقبالؔ فخر شاہی اور فقر خانقاہی کو مسلمانوں کیلئے مضر اور اسلام کیلئے نقصان سمجھتے تھے چنانچہ ارمغان حجاز میں مسلمانوں کو ''منسلک شبیریؑ'' کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؑ — کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

ایک اور مقام پر مثنوی میں فرماتے ہیں۔

فقر عریان گر مئی بدر و حنین — فقر عریان بانگ تکبیر حسینؑ

یعنی حقیقی فقر اسلامی معرکہ بدر و حنین اور تکبیر امام حسینؑ علیہ السلام ہے۔ علامہ اقبالؔ اُس تصوف سے نفرت رکھتے تھے جو مسلمانوں کو شجاعت سے دور، عمل سے بیگانہ اور کوشش و جدوجہد سے علیحدہ کر کے ترک دنیا کی طرف مائل کرے۔ وہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے تھے کہ عزت نشینی کی زندگی چھوڑ کر نقشِ قدم امام حسینؑ پر چلیں جو صرف فداکاری، ایثاری اور قربانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ خود علامہ اسی مسلک کے پیرو تھے چنانچہ پیام مشرق میں ارشاد فرماتے ہیں۔

تیر و سناں و خنجر و شمشیرم آرزو ست — با من میا کہ مسلک شبیریمؑ آرزو ست

یعنی تیر و نیزہ و خنجر اور تلوار میری خواہشات ہیں۔ اے نام و نہاد (مسلمان) میرے ساتھ مت چل کیونکہ میری آرزو امام حسینؑ کی طرح حق پر قربانی کرنا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ نقش قدم امام حسینؑ پر چلنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ یہ قربانی، فداکاری، ایثار اور عشق حقیقی کا راستہ ہے اور اسی لیے علامہ نے فرمایا۔

زندہ حق از قوتِ شبیری است — باطل آخر داغ حسرت میری است

بہر حق در خاک و خون غلطیدہ است — پس بنائے لا الہ گردیدہ است

علامہ فرماتے ہیں پیغام حق امام حسینؑ کی شہادت سے زندہ ہے جس نے باطل کو ہمیشہ کیلئے مایوس اور نابود کر دیا ہے۔ اور اسی حق کو بچانے کے لئے امام حسینؑ اور انکے جانباز اپنے خون میں نہائے اور اسطرح اسلام کی مجدد بنیاد ڈالی اور اُسے ہمیشہ کیلئے باقی رکھا۔ اسی مضمون کو ۷ سو سال قبل حضرت معین الدین چشتی سنجری نے یوں ادا کیا۔

شاہ است حسینؑ پادشاہ است حسینؑ دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سرداد نداد دست در دستِ یزید حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

علامہ اقبالؔ رموز بیخودی میں حضرت سید الشہداؑ کی شان میں ایک طویل (۳۹) اشعار پر مشتمل نظم میں فرماتے ہیں۔

آں امام عاشقاں پور بتولؑ سرو آزادے زبستان رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر معنی ذبح عظیم آمد پسر

یعنی امام حسینؑ حقیقی عاشقوں کے امام اور حضرت فاطمہؑ کے بیٹے ہیں۔ آپ رسول کریمؐ کے باغ کے سرو ہیں۔ دوسرے شعر میں اقبالؔ اشارہ کر رہے ہیں حضرت علیؑ کے اُس جملے کا کہ "بسم اللہ کی ب" کا جو نقطہ جو خلاصہ قرآن ہے میں ہی ہوں "یعنی اللہ رے حسینؑ کی عظمت جنکا باپ بائے بسم اللہ اور جو خود ذبح عظیم کی تفسیر ہیں۔ بال جبریل میں فرماتے ہیں۔

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم نہایت اسکی حسینؑ ابتدا ہے اسماعیلؑ

علامہ فرماتے ہیں کی کعبہ کی داستاں سادہ اور دلچسپ ہوتے ہوئے بھی عجیب اور غریب معلوم ہوتی ہے اسکی بنا جو حضرت ابراہیمؑ نے رکھی، اسکے قیام میں حضرت اسماعیلؑ نے شدت تشنگی سے ایڑیاں رگڑیں' حضور اکرمؐ نے اسے بتوں سے پاک کیا اور حضرت امام حسینؑ نے اسکی حرمت کو اپنی جان و مال کی قربانی دے کر بام عروج پر پہنچایا اور قیامت تک کیلئے محکم بنا دیا۔ امام حسینؑ عشق الٰہی کے پیامبر تھے اور دوسرے پیامبران عشق کی طرح اپنے عشق کا اظہار کر رہے تھے۔

صدق خلیلؑ بھی ہے عشق صبر حسینؑ بھی ہے عشق معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

سرّ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ بود　　یعنی آں اجمال را تفصیل بود

رموز بیخودی میں واقعہ کربلا کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

چوں خلافت رشتہ از قرآن گسیخت　　حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوہ خیر الامم　　چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
بر زمین کربلا بارید و رفت　　لالہ در ویرانہ ھا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد　　موج خونِ او چمن ایجاد کرد

یعنی خلافت نے قرآن مجید سے اپنا تعلق ختم کر لیا اور خلافتِ اسلامی اور قرآنی اُصولوں کو چھوڑ کر ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور آزادی کو زہر دے دیا گیا تب محمدؐ کا نواسا، علیؑ کا بیٹا حسینؑ اس ظالمانہ رویہ کو برداشت نہ کر سکا اور رحمت للعالمین کا نواسا ابر رحمت بن کر بڑھا اور کربلا کی زمین پر خون کی ایسی بارش کی کہ کربلا کے دشت کو شھیدوں کے گلستان میں تبدیل کر دیا اور قیامت تک ظلم وستم کا خاتمہ کر کے آزادی کے گلشن میں زندگی ڈالی۔ میدان کربلا میں امام حسینؑ اللہ کے نام کے ساتھ ساتھ ملتِ اسلام کی نجات کا عنوان بھی رقم کر رہے تھے۔

نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت　　سطرِ عنوان نجات ما نوشت

پھر علامہ فرماتے ہیں۔

دشمناں چوں ریگ صحرا لاتعد　　دوستان او بہ یزداں ھم عدد

یعنی امام حسینؑ کے دشمن ریگستان کے ذرّوں کی طرح لاتعداد تھے جبکہ آپ کے جانباز دوست صرف یزداں کے ہم عدد یعنی بہتر (۷۲) تھے (یزداں=ی=۱۰ ز=۷ د=۴ ا=۱ ں=۵۰ =۷۲)

علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں امام حسینؑ اپنی ملت میں ایسی اہمیت رکھتے تھے جسطرح قرآنِ مجید میں حرف قل ھو اللہ احد۔

درمیان امت آں کیواں جناب　　ھمچو حرف قل ھو اللہ در کتاب

حق اور باطل کی جنگ ازل سے رہی ہے اور قیامت تک جاری رہیگی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید — ایں دو قوت از حیات آمد پدید

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

ملتِ اسلام کی غفلت اور ناکامی کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں، شہادت امام حسینؑ سے ہی تمام مشکلات کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔

ریگِ عراق منتظر کشتِ حجاز تشنہ کام — خونِ حسینؑ باز دہ کوفہ وشام خویش را

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلۂ وفرات

قرآن مجید جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی ہے اسکا راز بھی حسینؑ سے سیکھا جاسکتا ہے چنانچہ اقبالؔ فرماتے ہیں۔

رمزِ قرآن از حسینؑ آموختیم — ز آتشِ اُو شعلہ ھا اندوختیم

یعنی میں نے قرآن کا راز حسینؑ سے سیکھا ہے اور اسی حسینی شعلے سے اپنے چراغوں کو شعلہ ور کیا ہے۔

امام حسینؑ کی شہادت کی منزلت اور عظمت کو بیان کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں۔

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر — مرگِ پورِ مرتضیٰؑ چیزی دیگر

یعنی ہر قسم کی شہادت مومن کیلئے فضیلت ہے لیکن ابن علیؑ کی شہادت بے مثال ہے۔

پھر فرماتے ہیں۔

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیریؑ — بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

علامہ اپنے عشق کو بے نقاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جسطرح مجھکو شہید کربلا سے پیار ہے — حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

رونے والا ہوں شہید کربلا کے غم میں میں — کیا دُر مقصد نہ دینگے ساقیِ کوثر مجھے

اے صبا اے پیکِ دور افتادگان — اشکِ ما بر خاکِ پاکِ اُو رساں

یعنی اے بادِ صبا اِس عاشق دور افتادہ کے آنسوؤں کو حضرت کے مزار تک پہنچا دے۔

ارمغان حجاز میں فرماتے ہیں۔

قلندر میل تقریری ندارد بجز ایں نکتہ اکسیری ندارد
از آں کشتِ خرابی حاصل نیست کہ آب از خونِ شبیری ندارد

یعنی یہ قلندر جو صرف تقریر کرنا پسند نہیں کرتا صرف ایک نکتہ جو اکسیر حیات اور ثمر زندگی ہے بتانا چاہتا ہے کہ اسلامی زمین جو بنجر اور ویران ہو چکی ہے اُس سے کوئی بھی چیز اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُسے خونِ شبیرؓ سے سیراب نہ کیا جائے۔

اقبالؔ کا تصورِ زمان و مکان

(معروف سائنس دان ڈاکٹر رضی الدین کی تصنیف پر تبصرہ)

برصغیر کی نامور نابغہ روزگار شخصیت مرحوم ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے انتقال کی افسوس ناک خبر پڑھ کر اقبالیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے یہ اپنا اخلاقی فرض سمجھا کہ مرحوم کے اُس اعلیٰ اور نایاب کتابچہ کا تعارف کیا جائے جو عدیم المثال ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین کی کتاب ''اقبال کا تصوّر زمان و مکان'' جو (۴۸) صفحات پر مشتمل ہے اور جسے عبدالرزاق، تاجر کتب حیدرآباد دکن نے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا ہے اُس کا ایک نسخہ میرے والد مرحوم کی لائبریری سے مجھے ملا جو ادبی اور سائنسی اعتبار سے ایک شاہکار تصوّر کیا جاسکتا ہے۔ اِس کتاب کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر رضی الدین نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کے سائنس داں تھے بلکہ عربی فارسی اور اُردو کے ادیب ہوتے ہوئے مسائل فلسفہ اور منطق سے بھی عمیق واقفیت رکھتے تھے۔ اگرچہ اِس تعارفی مضمون میں میرے لیے یہ بات ممکن نہیں کی اِس کتاب کے تمام گوشوں اور نتائج کو پیش کرسکوں کیونکہ خود ڈاکٹر رضی الدین نے سمندر کو کوزہ میں سمو دیا ہے لیکن بہرحال میری کوشش یہ ہوگی کی اِس گلشن فکر و خیال سے اِس طرح گذر جاؤں کہ مشامِ زمان و مکان قاری کو اس گلشن یعنی اِس کتاب کے مطالعہ کے لیے آمادہ کردے۔

زمان و مکان (Time and Space) ایک ایسا موضوع ہے جس کا تعلق دنیا کے مختلف علوم سے مستقیم اور غیر مستقیم ہے۔ علامہ اقبالؔ نے جن بنیادی مسئلوں کو اپنا موضوع بنایا ہے اُن میں زمان و مکان کا سائنسی اور فلسفانہ مسئلہ بھی شامل ہے۔ اِس موضوع پر اقبالؔ کے منظوم کلام اور اُن کے نثری خطبات جو آپ نے ۱۹۲۸ء میں حیدرآباد دکن اور مدراس میں انگریزی میں دیے تھے اور جو ۱۹۳۰ء میں ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے نام سے شائع ہوئے بحث کی گئی۔ علامہ اقبالؔ خطبہ (۱۸۲) میں فرماتے ہیں کہ ''اسلامی مسائل کا نصب العین اور مقصود یہی ہے کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمو دیا جائے چنانچہ زمان اور مکان کا سوال مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ علامہ اقبالؔ کو

یقین تھا کہ اگرچہ سائنس اور حکمت محدود ہیں اور ہماری قلبی واردات اور روحانی زندگی کے لیے مشعل راہ نہیں بن سکتے لیکن آپ جدید سائنس کے اُصول کے مطالعہ اور اُن کی روشنی میں فلسفہ اور مذہب کے بنیادی مسئلوں کو ضروری سمجھتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں۔

گفت حکمت را خدا خیر کثیر   ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر
(خدا نے حکمت کو نیک کام کہا ہے چنانچہ جہاں بھی یہ نیکی ملے لے لو)

علم اشیاء علم الاسما ستے   ہم عصا وہم ید بیضا ستے
(علم سائنس ناموں کا علم ہے جو موسیٰؑ کے عصا اور ہاتھ کا علم ہے)

علم اسما اعتبار آدم است   حکمتِ اشیاء حصار آدم است
(علم اسما سے انسان کا اعتبار قایم ہے کیونکہ اس علم سے انسان کی حفاظت ہوتی ہے)

علم حرف و صوت را شہپر دہد   پاکی گوہر بہ ناگوہر دھد
(علم الفاظ اور آواز کو پرواز دیتا ہے اور قطرہ سمندر کو موتی بناتا ہے)

دل اگر سوزد بہ حق پیغمبری است   ور زحق بیگانہ گردد کافری است
(اگر دل حق کی تلاش کرے تو پیغمبری ہے ورنہ وہ کافری ہے)

ڈاکٹر صدیقی نے اِس کتاب میں پہلے زمان ومکان کے متعلق عوام کے عامیانہ تصورات، اہل یونان کے تصورات اسلامی علماء کے تصورات اور جدید فلاسفر اور سائنس دانوں کے تصورات بیان کر کے علامہ اقبالؔ کی اُن پر تنقید اور تائید پر تفصیل سے بحث کی ہے اور پھر علامہ اقبالؔ کے خیالات جو آیات قرآنی، احادیث پیغمبر اکرمؐ اور فلسفہ اسلامی پر مبنی ہیں بیان کیے ہے۔

عام طور پر عوام، زمان (Time) کو ایک خارجی چیز سمجھتے ہیں جو انسان کے شعور سے اِس طرح گذرتا ہے جس طرح کوئی دریا ایک پُل کے ستونوں پر سے گذرتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت وقت کو موتی کی ایک مالا کہا جا سکتا ہے جس میں مختلف موتی پروئے ہوتے ہیں۔ یہ موتی در حقیقت واقعات ہیں جو ترتیب کے ساتھ رونما ہوتے ہیں اور انکے درمیان ایک فاصلہ ضرور ہوتا ہے ۔ عوام، مکان

(Space) کو مختلف اشیاء کے مقامات سے تعین کرتے ہیں چنانچہ اس نظریہ کے تحت اشیاء کے درمیان ایک فاصلہ ہوتا ہے اگرچہ وہ کتنے ہی قریب کیوں نہ ہوں۔ یہ نظریات اسلامی نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں ہیں۔

یونانی حکیم افلاطون نے بتلایا کہ مکان (Space) وہ ہے جس میں تمام اجسام واقع ہیں اور وہ ہمیشہ غیر متغیر ہے اس کے مطابق مکان کوئی خارجی مطلق شئے نہیں ہے۔ یونانی حکیم زینو کے مطابق کائنات سکونی ہے اور اس میں حرکت نہیں ہے۔ علمائے اسلام نے بڑی شدت سے یونانی نظریہ زمان کی مخالفت کی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اپنے خطبات میں مسلمانوں کے مختلف مکاتیب مثلاً اشاعرہ، معتزلہ، اور دیگر علماء خاص طور پر اشعری، ابن حزم اور عراقی کے افکار پر تفصیلی تنقید وتبصرہ کرکے یہ بتلایا ہے کہ کس طرح مسلم مفکرین نے یونانیوں کے سکونی تصورِ کائنات کے خلاف بغاوت کی ہے۔ علامہ کہتے ہیں، اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ دنیا جیسی کچھ ہے اُسی سے سابقہ رکھو اور یہ فکر چھوڑ دو کہ دنیا کو ایسا ہونا چاہیے تھا۔ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہماری کائنات ایک ارتقا پذیر متحرک کائنات ہے اور چونکہ حرکت اس کا اساسی جزو ہے اس لیے کائنات کے ہر نظام میں اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

فریب نظر ہے سکون و ثبات　　　تڑپتا ہے ہر ذرّہ کائنات

قرآن مجید کو اُم الکتاب کا لقب اِس لیے دیا گیا ہے کہ اس میں ساری تاریخ عالم علت ومعلول کے سلسلہ سے آزاد ہوکر ایک مافوق الدوام ''اب'' میں سماجاتی ہے۔ علامہ اقبالؔ مشہور سائنس داں آئین سٹائین کے بڑے مداح اور معترف تھے چنانچہ ''پیام مشرق'' میں اُنھوں نے ایک پوری نظم اس نابغہ روزگار کی شان میں لکھی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے فرمایا کہ آئین سٹائین کے نظریہ اضافیت کی وجہ سے مادّہ پرستوں اور دہریوں کا خدا کی ہستی کے خلاف یہ استدلال کہ ایک غیر مادّی خالق اشیاء کو کس طرح پیدا کرسکتا ہے، ہمیشہ کے لیے تمام ہوگیا کیونکہ آئین سٹائین نے اپنی تجربہ گاہ میں یہ ثابت کردیا کہ مادّہ (Material) اور توانائی (Energy) دو مختلف اشیا نہیں ہیں بلکہ ایک ہی شئے کی مختلف شکلیں ہیں چنانچہ اس انکشاف نے ایک وسیع انقلاب برپا کیا۔ علامہ اقبالؔ نے جاوید نامہ میں

''ذروان فرشتہ'' کے تذکرہ میں اس حرکت زمان و مکان کے فلسفہ کو نظم کیا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور — از شعور است این کہ گوئی نزد و دور

(نزدیکی اور دوری کا احساس شعور میں ہے، معراج حقیقت میں شعور کے انقلاب کا نام ہے)

مشت خاکی مانع پرواز نیست — این بدن باجان ما انبار نیست

(ہمارا بدن ہماری جان کے لیے انبار نہیں ہے۔ ہمارا بدن کسی طرح پرواز میں حائل نہیں ہے)

علامہ اقبال نے ''فرشتہ ذروان'' کی دو صورتیں بتلائیں ہیں جن میں ان کی مراد یہ ہے کہ زمان و مکان کی اضافی خاصیت کا اظہار کیا جائے۔ مولانا روم اقبال سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

فارغ از پیچاک این زنار شو — برزمان و بر مکاں اسوار شو

(زمان اور مکان پر مسلط ہو جاؤ اور اس گردش سے فراغت حاصل کرو)

این دو یک حال است از احوال جاں — چشم بکشا بر زمان و بر مکاں

(اگر آنکھیں کھول کر زمان اور مکاں کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا یہ ہماری زندگانی کا ایک ہی رخ ہے)

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے تصور کے منافی اس سے زیادہ کوئی تصور نہیں ہو سکتا کہ کائنات سوائے ایک بنے بنائے نقشہ کے سوا کچھ نہیں، جس کے مطابق کام ہو رہا ہے۔ قرآن کی تعلیم کے مطابق کائنات حرکاتی ہے یہ ایک ہر دم تشکیل پانے والی کائنات ہے نہ کہ ایک مکمل چیز جو اپنے خالق کے ہاتھوں سے بہت عرصے پہلے نکلی تھی اور اب فضا میں مادّہ کے ایک تودہ کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ بال جبریل میں فرماتے ہیں۔

سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات — سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات

سلسلہ روز و شب تار حریر دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلہ روز و شب ساز ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا — ایک زمانہ کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

علامہ اقبالؔ مثنوی اسرار خودی میں فرماتے ہیں۔

اصل وقت از گردش خورشید نیست　　وقت جاوید است و خور جاوید نیست
وقت را مثلِ مکاں گسترده　　امتیاز دوش و فردا کرده
زندگی از دہر و دہر از زندگیست　　لاتسبوا الدھر فرمانِ نبیؐ است

بالِ جبریل میں علامہ اقبالؔ نے ''زمانہ'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے، جس میں وقت اپنی صفات کا اظہار خود اپنی زبان سے کرتا ہے۔

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ　　قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں　　میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی ہے　　ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اسرار خودی میں علامہ نے مطالب کو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کے عرصے میں منظوم کیئے جب کہ آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت ابھی عام رواج پیدا نہیں کیا تھا۔ پروفیسر ایڈنگٹن کی کتاب ''نیچر آف فزیکل ورلڈ'' بھی ۱۹۲۸ء میں لکھی گئی جو زمان اور مکان پر ایک شاہکارانہ بحث ہے، بہر حال علامہ اقبالؔ کی فکر بھی اِن نابغہ روزگاروں سے کم نہ تھی، شاید اسی لئے علامہ نے اپنے بارے میں فرمایا تھا۔

'' دگر دانائے راز آید کہ ناید ''

علامہ اقبالؔ کا شاہین

(شاہین کے موضوع پر علامہ اقبال کے فارسی اور اُردو اشعار پر مشتمل پہلا تحقیقی جایزہ)

کسی مشاعرہ میں بابائے ظرافت سید ضمیر جعفری کا یہ مزاحیہ، طنزیہ اور سنجیدہ شعر گوش زد ہوا

ڈاکٹر اقبالؔ کا شاہین کب کا اڑ گیا
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو

اِس مصرعہ اولیٰ میں ''اقبالؔ کا شاہین'' میری فکر و توجہ کا مرکز بنا اور اِسی شاہین کی تلاش میں سب سے پہلے میں نے پرندہ شناسی کی کتابوں کا مطالعہ کیا تا کہ شاہین کے جغرافیائی، تاریخی، ماحولی، خاندانی اور فطرتی حالات کا علم ہو سکے۔ پھر اِن معلومات کی روشنی میں شاہین کو علامہ کی تحریروں اور تقریروں میں ڈھونڈنے کی کوشیش کی اور آخر میں علامہ اقبالؔ کے فارسی اور اُردو کلام کے آئینہ میں شاہین کی مکمل تصویر اور تنویر دیکھی جس کا عکس آپ کی نظر کے سامنے ہے۔

یوں تو علامہ اقبالؔ کے شاہین پر مختلف تحریریں، اقتباسات اقبالیات کے دامن میں نظر آتی ہیں لیکن یہ پہلی تحقیقی تحریر ہے جس میں علامہ کے (۶۳) اشعار کو شامل کیا گیا ہے اور اِس موضوع پر کُل فارسی اور اُردو اشعار جن کی تعداد (۱۰۶) ہے زیر مطالعہ اور بحث قرار دئے گئے ہیں۔

علامہ اقبالؔ سے قبل اور علامہ اقبالؔ کے بعد اغلب فارسی اور اُردو کے شاعروں نے اپنے کلام میں بعض پرندوں کو اُن کی فطرت، آواز، رنگ و شکل اور ماحولی کیفیت کے اعتبار سے نظم کیا ہے جن میں مرغ عشق، بلبل، زاغ، زغن، قمری، کبوتر، عقاب، شاہین، مور، طوطا، کبک، فاختہ اور چڑیا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بعض شعراء نے اِن پرندوں کی جمالی تصویر اور فطرتی تفسیر بھی کی ہے اور دنیائے ادب میں ان موضوعات پر چھوٹی بڑی نظمیں نظر آتی ہیں۔ لیکن علامہ اقبالؔ کی طرح دنیا کے کسی شاعر نے ایک خاص پرندہ کے فطرتی تقاضوں کو تمثیلی طور پر انسان کی کامیاب زندگی کے لیے مشعل راہ بنا کر پیش

نہیں کیا۔ علامہ نے اِس بات کی کوشش کی کہ ملت اسلامیہ دنیا کی دوسری قوموں میں اِس طرح زندگی کرے جس طرح پرندوں کی دنیا میں شاہین ۔ چنانچہ اس طرح علامہ اقبال کی مختلف فلسفانہ نظرات جن میں خودی، بیخودی، تصوّف، جہاد، اجتہاد، اور مردِ مومن شامل تھے، شاہین بھی شامل ہو گیا۔ اِسی لیے علامہ کی تصویر کے ساتھ بعض اوقات شاہین کا عکس نظر آتا ہے۔

۱۲ر ڈسمبر ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبالؔ مولوی ظفر احمد صدیقی کو خط میں لکھتے ہیں۔ شاہین بے شک ایک پرندہ ہے اور میں نے اسے اپنے اشعار میں ایک علامتی کردار کی حیثیت بھی دی ہے۔ اِس کا اندازہ ان عوامل سے ہو سکے گا جن کا تعلق شاہین کی فطری خصوصیات سے ہے۔ میرے کلام میں شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ نہیں ہے۔ اِس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ وہ خوددار اور غیرت مند ہے کہ کسی اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، دوسرے یہ کہ بے تعلق ہے آشیانہ نہیں بناتا، سوم یہ کہ بلند پرواز ہے، چہارم یہ کہ خلوت پسند ہے اور سب سے آخری بات یہ کہ تیز نگاہ رکھتا ہے۔ میرے نزدیک اسلام میں مردِ مومن کی خصوصیات بھی کم و بیش یہی ہیں جو بظاہر اس حقیر سے پرندے میں پائی جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ میں نے شاہین کو اپنے اکثر اشعار میں ایک علامتی کردار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

یہاں اِس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ شاہین کے علاوہ اقبالؔ نے اِسی خاندان کے دوسرے پرندوں جن کی عادات و اطوار شاہین کی طرح ہوتے ہیں شعری ضرورت کے طور پر استعمال کیا ہے جن میں عقاب (Eagle) شہباز (Hawk) اور دریائی عقاب (Osprey) قابلِ ذکر ہیں۔

اگرچہ علامہ کی نثری حوالہ جات میں یہی پانچ خصوصیات شاہین کی نظر آتی ہیں لیکن آپ کے منظوم کلام میں جو اُردو میں بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز اور فارسی میں اسرار خودی، رموز بیخودی، زبور عجم، پیام مشرق، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد، اے اقوام مشرق اور ارمغان شامل ہیں تقریباً دس شاہین کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ یعنی (۶) شاہین کلمہ گویوں کی طرح دنیا کے ہر حصّے میں پایا جاتا ہے (۷) شاہین جسور اور دلیر ہوتا ہے (۸) شاہین تیز رفتار اور اس کی ضرب کاری ہوتی ہے (۹)

شاہین ہر رنگ کا ہوتا ہے (۱۰) شاہین پرندوں کی دنیا میں ممتاز اور منفرد ہے۔

علامہ اقبال کے اُردو کلام میں (۴۲) اشعار شاہین پر اور پانچ اشعار شاہین صفت پرندے باز، شہباز، اور عقاب پر ملتے ہیں۔ جس میں ایک (۸) اشعار پر مشتمل نظم "شاہین" بال جبرئیل میں شامل ہے۔ آپ کے فارسی کلام میں (۳۲) اشعار شاہین پر اور (۲۷) اشعار شاہین صفت باز، شہباز، پر نظر آتے ہیں جن میں دو نظمیں "شاہین و ماہی" اور "پند باز بہ بچہ خویش" "پیام مشرق" میں شامل ہے۔ اِس طرح اس موضوع پر کُل (۱۰۶) اشعار موجود ہیں۔

اگر چہ اسلامی حکومتوں کا زوال اٹھارویں صدی سے شروع ہو چکا تھا لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں کی کسمپرسی اور ان کا معنوی، اقتصادی اور اخلاقی زوال انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ ساری دنیا میں ملّتِ اسلامیہ ذلّت وخواری اور تفرقہ کاری میں مبتلا تھی۔ ایسے مایوس دور میں حکیم الامت انھیں شاہین کی مثال دے کر بلند پروازی کی دعوت دے رہے تھے۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں
شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا — پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد
میان شاخساراں صحبت مرغ چمن کب تک — تیرے بازو میں ہے پرواز شاہین قہستانی
حماں فقیہ ازل گفت چرہ شاہین را — بہ آسمان گروی با زمیں نہ پردازی
تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تو — فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
تیرے صید زبوں افرشتہ و حور — کہ شاہین شہ لولاک ہے تو
زد بانگ کہ شاہنم وکارم بہ زمین چیست — صحرا است کہ دریا است تہہ بال و پر ماست

(ترجمہ) پکارا کہ میں شاہین ہوں مجھے زمین سے کیا کام۔ صحرا ہو کہ دریا سب میرے پیروں کے نیچے ہیں)۔

گرفتم این کہ چوں شاہین بلند پروازی — بہوش با شد کہ صیاد ما کہن دام است

(ترجمہ) چونکہ ہم شاہین بلند پرواز ہیں اس لیے ہوشیار زندگی چاہیے کیونکہ ہمارا صیاد تجربہ کار ہے۔

تو عقابی طایف افلاک شو — بال وپر بگشا و پاک از خاک شو

(ترجمہ) تم عقاب کی طرح آسمان سے وابستگی رکھتے ہو اس لیے پرواز کرو اور خاک سے پاک ہو جاؤ۔

جامعہ اسلامی میں شہنشاہی نظام 'جاگیرداری نظام' خانقا مزاجی اور دریوزہ گری کا رواج عام تھا۔ ہر شخص کام وکاج سے کتراتا تھا اور قضا وقدر کا بہانہ کر کے مفت خوری میں مبتلا تھا۔ ہر شخص کی آنکھیں دوسروں کے مال و دولت پر جمی ہوئی تھی جب کہ دنیا کی دوسری اقوام دن دوگنے رات چوگنے ترقی کر رہے تھے اور محنت اور مشقت اُن کا شیوہ تھا۔ اِس خوابیدہ قوم کو جگانے کے لیے علامہ نے شاہین صفت کردار کو اپنانے کی پیش کش کی تا کہ مسلمان دوسروں کے محتاج نہ رہیں اور اپنی کھوئی عظمت وعزت دوبارہ حاصل کر سکیں۔

نگاہ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے　　شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں
پھرا فضاؤں میں کرکس اگرچہ شاہیں وار　　شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا
رزق زاغ و کرکس اندر خاک گور　　رزق بازان در سواد ماہ و حور

(ترجمہ) کوے اور گیدڑ کا رزق قبر کی خاک میں ہے لیکن باز کا رزق چاند اور سورج کی جستجو میں چھپا ہے

دانہ دانہ گوہر از خاکش مگیر　　صید چون شاہین از افلاکش بگیر

(ترجمہ) خاک سے دانہ دانہ مت اُٹھا۔ شاہین کی طرح اپنا شکار آسمان سے حاصل کر۔

ندارد کار بادون همتان عشق　　تذرو مردہ را شاہین نگیرد

(ترجمہ) عشق کبھی پست ہمتوں سے کام نہیں رکھتا۔ مردہ تذرو کو کبھی شاہین نہیں پکڑتا۔

علامہ اقبالؔ کے نظریہ کے مطابق وطن پرستی اقدار اسلامی کے مغائیر ہے چونکہ اسلام کوئی سرحد نہیں رکھتا اسی لئے تو حضور اکرمؐ کی حدیث کو علامہ نے نظم کر کے کہا تھا۔

مسجد من ایں همہ روی زمین

(میری مسجد تمام کرہ ارض پر پھیلی ہوئی ہے)

وطن سے محبت اور وطن کی حفاظت کرنے کی اسلام تاکید کرتا ہے۔ جب بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم ممالک میں وطن پرستی کی وبا پھیلنے لگی تو علامہ نے فرمایا۔

ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے　　جو پیرہن اس کا ہے وہ ملّت کا کفن ہے

علامہ نے وطن سے پیار اور محبت کرتے ہوئے بھی ساری دنیا کے ممالک سے رشتہ برقرار رکھنے کی تاکید کی فرماتے ہیں۔

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

(ہر ملک ہمارا ہی ملک ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا کی ملکیت ہے)۔

اس وطن پرستی یا آشیانہ بندی ' جدائی اور تفرقہ کو مضر جانتے ہوئے علامہ نے شاہین صفت زندگی گذارنے پر مشورہ دیا۔ یہاں پر اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ شاہین پہاڑوں اور چٹانوں پر اپنا خاندان تشکیل دیتا ہے اور رہبانیت کا پیرو نہیں ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کی گنبد پر　　تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں　　کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ

گذار اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ بیاباں میں　　کہ شاہین کے لیے ذلت ہے کار آشیاں بندی

چنین یاد دارم زبازان پیر　　نشیمن بشاخ درختی مگیر

(ترجمہ) بڈھے باز کی نصیحت مجھے یاد ہے کہ کبھی کسی درخت کی شاخ پر نشیمن تعمیر نہ کرنا۔

کنامی مگریم در باغ و کشت　　کہ داریم در کوہ و صحرا بہشت

(ترجمہ) میرا گھر باغ اور کھیتوں میں نہیں ہے کیونکہ میری جنت تو دشت اور صحرا میں ہے۔

خلوت پسندی، اندیشہ گیری اور خود شناسی انسانی اقدار کی اعلیٰ صفتیں ہیں۔ اس سے انسانی جوہر آشکار ہوتا ہے اور ایک بے ذر، ابوذر بن جاتا ہے۔ علامہ کا مرد مومن ان صفات سے منزہ ہے۔ محافل شعر و رقص، درباری اجلاس و جلوس، بزم عیش و نوش، خانقاہوں کے رسومات، میخانوں کے حکایات اور میلوں عروسوں کے خرافات جامعۂ اسلامی کے لیے افیون کا قرض بن چکے تھے اور علامہ اس نشہ کو خلوت کی ترشی سے کاٹنا چاہتے تھے چنانچہ شاہین کی خلوت پسندی کی مثال لے کر ملت اسلامیہ کو خلوت گری، خود شناسی اور خودی پر غور کرنے کی دعوت دی۔

مجو انجمن مثل آہو و میش ٭ بہ خلوت گرا چون نیا کان خویش

(ترجمہ) ہرنوں اور بھیڑوں کی طرح گلہ کی تلاش میں مت رہو بلکہ اپنے اسلاف کی طرح خلوت پسند ہو۔

ع۔ بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھکو

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم ٭ ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

فکر و تدبر، باریک بینی اور معرفت الٰہی میں غور و خوص کرنا بڑی عبادت ہے۔ یہی وہ ریاضت تھی جس کی وجہ سے صدر اسلام میں وہ شخصیتیں نمودار ہوئیں جو نابغۂ روزگار شمار کی جانے لگیں۔

تاریخ اسلام کا دامن ان روشن ہستیوں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن جب سے ملّت اسلام نے اسلاف کے طریقہ کار یعنی غور و خوص، باریک بینی اور تجسّس سے کنارہ کشی اختیار کی ہے مسلمان روز بروز زوال اور تاریکیوں کے شکار ہونے لگے۔ چنانچہ اسی لیے علامہ اقبالؔ نے شاہینی نگاہ جو آسمان میں پرواز کرتے ہوئے بھی ہری گھانس پر ہرے رنگ کی ٹڈی کو دیکھ سکتا ہے، علامت باریک بینی بنا کر دعوت فکر دی ہے۔ چند اشعار اس ضمن میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا ٭ جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش

افسوس صد افسوس کہ شاہین نہ بنا تو ٭ دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارات

یہ مانا اصل شاہینی ہے لیکن ٭ تیری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

چیتے کا جگر چاہیے شاہین کا تجسس ٭ جی سکتے ہیں بے روشنی دانش فرنگ

علامہ اقبالؔ نے مرد کامل، مرد مجاہد، مرد مومن، مرد فقیر اور مرد قلندر کے فلسفہ میں شجاعت اور دلیری کو مرکزی حیثیت دی ہے اسی لئے تو افغانستان کے سفر پر ظاہر شاہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

نی شناسی معنی کرّار چیست ٭ ایں مقامی از مقامات علیؓ ست

(ترجمہ) جانتے ہو کرار کے معنی کیا ہیں یہ ایک مقام حضرت علیؓ کے مقامات (فضیلت) میں سے ہے۔

مسلم ھندی چرا میداں گذاشت ٭ ہمت او بوی کرّاری نداشت

(ترجمہ) ہندوستاں کا مسلمان کیوں میدان سے بھاگا اس لیے کہ اس کی ہمت میں علیؓ کی شجاعت کی

ہوتی تھی۔ علامہ نے پرندوں میں شاہین کو اسی لئے انتخاب کیا کہ شاہین جسور اور دلیر ہوتا ہے۔ اگر چہ شاہین کا وزن ۴۔۵ پونڈ سے کم ہوتا ہے اور اس کے بدن کی لمبائی ڈیڑھ دو فٹ کے لگ بھگ ہوتی ہے لیکن پرندہ شناسی کے محققین کے خوابوں کی روشنی میں وہ جوان غزالہ، بکروں اور بھیڑوں کا بھی شکار کرتا ہے۔ مشہور پرندہ شناس محقق براؤن ۱۹۷۶ء نے بیان کیا ہے کہ اُس نے شاہین کو ایک بھیڑ کے بچے کا شکار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (برڈس انسکلو پیڈیا)

اس شجاعت اور دلیری کو مسلمانوں کے خون میں تازہ کرنے کے لیے علامہ نے جو اشعار نظم کیے ہیں اُن میں سے چند اشعار یہاں بیان کئے جا رہے ہیں۔

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے — کبوتر کے تن نازک سے شاہین کا جگر پیدا

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا — لہو گرم رکھنے کا ہے یہ بہانہ

بازوی شاہین کشا خونِ تذروان بریز — مرگ بود باز را زیستن اندر کنام

(ترجمہ) شاہین اپنے بازوں کو کھول اور تذروان پر حملہ آور ہو کیونکہ آشیانے میں خاموشی کی زندگی تیرے لئے موت ہے)۔

می فتد بر مرگ آں مرد تمام — مثل شاہینی کہ افتد بر حمام

(ترجمہ) وہ مرد کامل موت پر اس طرح لپکتا ہے، جس طرح سے ایک شاہین کبوتر پر۔

سینہ ای داری اگر در خورد تیر — در جہاں شاہین بزی شاہین بمیر

(ترجمہ) اگر شجاعت سے بھرا سینہ تیر کے قابل رکھتے ہو تو شاہین کی طرح زندگی کرو اور شاہین کی طرح مر جاؤ۔

نکو شیوہ و پختہ تدبیر باش — جور و غیور و کلان گیر باش

(ترجمہ) نیک کام پختہ تدبیر رہو اور دلیر و غیور اور اہمیت کے حامل رہو۔

نگہ دار خود را و خورسند ذی — دلیر و درشت و تنو مند ذی

(ترجمہ) خوشی اور خودداری کے ساتھ زندگی بسر کرو، طاقتور، دلیر اور شجاع ہو۔

شاہین چالاک اور ہوشیار پرندہ ہے۔ اسی لئے اس کو تربیت دے کر جانوروں کے شکار اور جنگوں میں نامہ بر کبوتروں کو ہلاک کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ پرندہ شناسی کا محقق زینوفر ۱۹۶۳ء لکھتا ہے کہ شکار اور جنگوں میں سب سے پہلے چار ہزار سال قبل شاہین کو استعمال کیا گیا اور پھر اس کے بعد عرب، ایران، آفریقہ اور یورپ میں اس پرندہ سے استفادہ کیا گیا۔ گوڑون ۱۹۳۵ء میں مارکو پولو کے حوالے سے لکھتا ہے کہ شہنشاہ تاتار وچنگیز خان آعظم اپنے قصر چانگ نور میں دو سو شاہین تربیت یافتہ شکار جنگی مہمات کے طور پر رکھتا تھا۔ علامہ نے ملت اسلامیہ کو ہوشیار اور بیدار زندگی گذارنے کی تاکید کی۔ علامہ فرماتے ہیں جس طرح شاہین دوسرے پرندوں کا شہباز ہے اُسی طرح مسلمان کو چاہئے کہ دوسری اقوام کے سردار بن کر زندگی بسر کرے۔ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

جان پدر نہیں ہے ممکن — شاہین سے تذرو کی غلامی

برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر — یہاں فقط سر شاہین کے واسطے ہے کلاہ

عشق طینت میں فرومایہ نہیں مثل ہوس — پر شاہباز سے ممکن نہیں پرواز مگس

توان گرفت زچشم ستارہ مردم را — خرد بدست تو شاہین تندرو چالاک است

کرگساں را رسم و آئین دیگر است — سطوت پرواز شاہین دیگر است

شاہین تیز رفتار اور اس کی ضرب کاری ہوتی ہے۔ ماہران پرندہ شناسی نے بتلایا ہے کہ شاہین جب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے تو وہ اوپر سے ایک تیر کے مانند اپنے شکار پر ٹوٹ پڑتا ہے اور ایک ضرب میں شکار کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ شاہین کے حملہ کی رفتار تقریباً (۱۲۵) میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؔ ملت اسلامیہ کو تیز رفتاری اور آسمان خراشی کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

بچہ شاہین سے یہ کہتا تھا عقاب سالخوردہ — اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں

وہ فریب خوردہ شاہین کہ پلا ہو کرگسوں میں — اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

وائی آں شاہیں کہ شاہینی نکرد — مرغکی از چنگ او نامد بدرد

جس طرح شاہین کے پر سرداروں کی دستار اور بادشاہوں کے تاج کی زینت رہتے ہیں۔ اُسی طرح اقبالؔ چاہتے تھے کہ مسلمان دنیا میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جائیں اور وہ اُس وقت ممکن ہے جب مسلمان خرافات کو چھوڑ کر حقیقت کو اپنا مسلک بنائیں اِسی لیے تو علامہ نے فرمایا۔

شہپر زاغ و زغن در پند قید و صید نیست ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

(ترجمہ) کوّے اور زغن کے پروں کی کسی کو ضرورت نہیں اس لیے کوئی اُن کو شکار نہیں کرتا لیکن شکاریوں کی نگاہیں شاہین اور شاہباز کے پروں پر جمی ہوتی ہیں۔

علاّمہ اقبالؔ نے اپنے فارسی اور اُردو کلام میں کئی مقامات پر ملّتِ اسلامیہ کی حمیت کو للکارتے ہوئے بتلایا کہ اسلامی علوم، اسلامی اصول اور اسلامی حکمت و دانش سے فایدہ اُٹھا کر دوسری اقوام ترقی کر رہیں ہیں اور مسلمان اِن سے کنارہ کشی کر کے روز بروز گرتے جا رہے ہیں۔

زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرغ کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روزگار

درّاج کی پرواز میں ہے شوکت شاہین حیرت میں ہے صیاد یہ شاہیں ہے کہ درّاج

شاہین کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز

میراث میں آئی ہے انھیں مسند ارشاد زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

زندگی سوز وساز بہ ز سکون دوام فاختہ شاہین شود از تپش زیر دام

علامہ اقبالؔ نے خود فرمایا تھا کہ میں ع۔ شاعر فردا ھستم (میں کل کا شاعر ہوں)

وہ اپنی تمام توانائی نئی نسل کی تعمیر اور تربیت پر صرف کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اُنھیں یہ دکھانا تھا کہ نئی نسل جو شاہینی صفات رکھتی ہے، اُسے مکتب، مدرسے، خانقاہ اور گھریلو ماحول کبوتر صفت، درّاج مزاج اور کبک خرام بنا رہے ہیں چنانچہ اس پر شدت سے احتجاج کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اُسی اقبالؔ کی میں جستجو کرتا رہا برسوں بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہین زیر دام آیا

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی خراب کر گئی شاہین بچے کو صحبت زاغ

ہر شئے ہوئی ذخیرۂ لشکر میں منتقل　　شاہیں گدائے دانہ عصفور ہو گیا

خشت را معمار ما کج می نہد　　خوی بط با بچہ ای شاہین دہد

تو اے شاہین نشیمن در چمن کردی از آں ترسم　　ہوای او بہال تو دہد پرواز کوتاہی

(ترجمہ) اے شاہین کیونکہ تو نے چمن میں آشیانہ بنایا ہے میں ڈرتا ہوں کہ اُس کی آب وہوا تیرے پرواز کو کم نہ کردے۔

علامہ اقبال نے اِس طلسم بدبختی کو توڑنے اور ملت کو جگانے کے لیے شاہین صفت اشعار لکھے جن میں صرف چند یہاں پیش کئے جارہے ہیں۔

از مقام خویش دور افتادہ ای　　کر کسی کم کن کہ شاہین ذا دہ ئی

(ترجمہ) تو اپنے مقام سے گر چکا ہے کر کس مت بن کیونکہ تو اولاد شاہین ہے۔

جوانوں کو مری آہ و سحر دے　　پھر ان شاہین بچوں کو بال وپر دے

علامہ اقبال نے اپنے آپ کو ''شاہین کافوری'' کہا ہے۔فرماتے ہیں ۔

فقیرانِ حرم کے ہاتھ اقبال آ گیا کیوں کر　　میسّر میر و سلطاں کو نہیں شاہین کافوری

اِس گفتگو سے اِس بات کا پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال کا فلسفہ شاہین بھی دوسرے نظرات کی طرح مستند اور محکم ہے۔اگر چہ اِس تحریر میں علامہ کے صرف (٦١) اشعار کو رقم کیا گیا ہے لیکن تمام (١٠٦) اشعار سے استفادہ کیا گیا جو اس موضوع پر اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ مسلمانوں کے لیے شاہین وار زندگی علامہ اقبال کی آرزو اور تمنا تھی۔

نہیں اقبال نا امید اپنی کشتِ ویراں سے　　ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی ذرخیز ہے ساقی

علامہ اقبال کا ابتدائی کلام

علامہ اقبال نے کس سال شاعری کا آغاز کیا اُس کا مطمئن بخش جواب ہمارے پاس موجود نہیں، لیکن اقبالیات کے طالب علم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ آپ کی ایک غزل سب سے پہلے ۱۸۹۳ء میں مجلّہ ''زبان'' میں شائع ہوئی تھی۔ اُس وقت اقبال کی عمر ۱۶ یا ۱۷ سال تھی اور وہ سیالکوٹ میں گیارہویں جماعت کے طالب علم تھے۔ پروفیسر حمید الدین خان مدیر مجلّہ ''زبان'' نے اس غزل کے ساتھ اقبال کو شاگرد بلبل ہند حضرت داغ دہلوی لکھا تھا یعنی اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کی اقبال کو حضرت داغ دہلوی سے شرف تلمیذی کم از کم ۱۸۹۳ء سے رہا ہوگا۔ علامہ اقبال کی یہ پہلی غزل ہے جو گلدستہ ''زبان'' دہلی کے شمارے ستمبر ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔

آب تیغ یار تھوڑا سا نہ لے کر رکھ دیا　　باغ جنت میں خدا نے آب کوثر رکھ دیا

اس کے دو مہینے کے بعد نومبر ۱۸۹۳ء میں جو غزل گلدستہ زبان دہلی میں شائع ہوئی اس میں یہ شعر خوب ہے۔ پھر اسی مجلّہ میں فروری ۱۸۹۴ء میں جو غزل چھپی اس کا مطلع یہ ہے۔

جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں　　پھر بھی یہ کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہو

چونکہ ان تینوں غزلیات میں عام پرانے اور بے لطف خیالات تھے جو ابتدائی مشق اور نوجوانی کا اثر تھا اس لئے گلدستہ زبان میں اشاعت کے باوجود اقبال قارئین کو متاثر نہ کر سکے۔ لیکن ۱۸۹۴ء کی ایک غزل۔

تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے　　یہ صدقہ ہوگی مرے سوال وصال کے

لاہور کے ایک مشاعرے میں پڑھی تو بڑی داد و تحسین حاصل ہوئی۔ جب اس غزل کا یہ شعر پڑھا۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے　　قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

تو شاہزادہ ارشد گورگانی جو اُس وقت مشاعرے میں موجود تھے تعریف کر کے کہنے لگے اقبال، اس عمر میں اور یہ شعر؟ چنانچہ یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور کے اہل علم افراد کو اقبال نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ذکر اقبال کے مصنف کے قول کے مطابق اقبال کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی چنانچہ اُن کی

بھابی یعنی عطا محمد کی بیوی بیان کرتی ہیں کہ "اقبال بازار سے منظوم قصے لا کر ہمیں لحن سے سنایا کرتے تھے ان کی آواز بہت شیریں تھی"۔ سری رام نے "خمخانہ جاوید" میں لکھا ہے کہ اقبال ابتدائے جوانی سے شعر اور استعداد شعر گوئی رکھتے تھے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اقبال نے پہلے اپنی مادری زبان پنجابی میں شاعری شروع کی اگرچہ آج وہ نمونے محفوظ نہیں ہیں۔

بعد میں شمس العلما میر حسن کی رہنمائی میں اُردو میں شعر کہنے لگے۔ یکتا حقانی نے "سیرت اقبال" میں لکھا ہے کی اقبال بچپن ہی سے شاعری کی طرف مائل تھے انھوں نے بارہا چھوٹی چھوٹی غزلیں کہیں اور اُن کاغذوں کو تلف کر دیا۔ "شعر اقبال" میں عابد علی عابد نے لکھا ہے کہ اقبال نے ارشد گورگانی کو اپنا ابتدائی کلام دکھایا ہے لیکن دوسرے محققین اقبال نے اس بات کی تصدیق نہیں کی کیوں کہ ارشد گورگانی سے ملاقات سے کئی سال قبل علامہ کا رابطہ خط و کتابت کے ذریعہ داغ دہلوی سے ہو چکا تھا اور داغ اقبال کے کلام پر اصلاح دینے لگے تھے اور یہ سلسلہ ۱۸۹۷ء میں ختم ہو گیا جب داغ دہلوی نے یہ لکھ بھیجا کہ "اب تمھارے کلام کو اصلاح کی ضرورت نہیں" علامہ اقبال نے فروری ۱۸۹۶ء میں ایک (۲۵) اشعار پر مشتمل نظم "فلاح قوم" کبھی اور کشمیری مسلمانوں کے جلسہ میں پڑھی جو آگے چل کر مارچ ۱۹۰۷ء میں کشمیری میگزین میں شائع بھی ہوئی۔ ۱۸۹۶ء دسمبر کے مجلّہ "شور محشر" میں ایک بیس اشعار کی غزل لکھی جس کے مقطعہ میں داغ کی شاگردی پر فخر کیا۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اُس پر مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخن داں کا

یہ غزل اقبال نے بازار حکیماں کے مشاعرے میں پڑھی جس میں مصرعہ طرح تھا۔

ع۔ مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا

۱۸۹۹ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے پندرہویں سالانہ جلسے میں اپنی خاص نظم "نالۂ یتیم" پڑھی ۱۹۰۰ء میں علامہ کی جو نظمیں منظر عام پر آئیں وہ کوہستان ہمالیہ (ہمالہ) الوداعی نظم اور ایک غزل تھی۔ اگرچہ انجمن حمایت اسلام کے جلسات ۱۹۵۱ء میں "خطاب یتیم بہ ہلال عید" ۱۹۰۲ء میں خطاب دانشکدہ اسلامیہ بہ مسلمانان پنجاب ۱۹۰۳ء میں فریاد امت اور ۱۹۰۴ء میں "تصویر درد" پڑھی

لیکن جس نظم سے اقبالؔ کی شہرت سراسر ہندوستان اور پنجاب کے ہر دیہات میں پھیل گئی وہ نظم ''نالۂ یتیم'' تھی جو مسدّس کی شکل میں ۳۵ بندوں پر مشتمل تھی۔ ''کلیات اقبالؔ'' کے مرتب عبدالرزاق لکھتے ہیں، جب اقبالؔ نے یہ نظم اپنے خاص ترنم میں پڑھی تو سب لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ اُن کی آنکھیں اشکبار اور اُن پر ایک وجد کی کیفیت طاری تھی۔ اکثر بند بار بار پڑھوائے گئے۔ چاروں طرف سے چندوں کی بوچھار ہونے لگی۔ اس نظم نے اقبالؔ کی شہرت کراچی سے رنگون اور کشمیر سے راس کماری تک پھیلا دی۔ روئیداد انجمن کے صفحہ (۳۰) پر لکھا ہے کہ شیخ محمد اقبالؔ نے "نالہ یتیم" جو چھپا ہوا تھا پڑھنا شروع کیا، اس کے ہر ایک شعر پر تحسین و آفرین کے نعرے چاروں طرف سے بلند ہو رہے تھے اور سیکڑوں آنکھیں تھیں جو دریائے اشک بہا رہی تھیں۔ اس نظم کے پڑھنے کے دوران تین سو روپے سے کچھ اوپر چندہ جمع ہو گیا اور کل کا پیاں اُسی وقت فروخت ہو گئیں۔ نظم ایسی مقبول ہوئی کہ چار چار روپے کو بھی ایک ایک کاپی بکی۔ اس جلسہ کے صدر مولانا نظیر احمد خان نے اقبالؔ کی تعریف میں کہا کہ ''میں نے انیسؔ اور دبیرؔ کی بہت سی نظمیں سنی ہیں لیکن واقعی ایسی دل شگاف نظم کبھی نہیں سنی''۔
اقبالؔ کی دوسری نظم جس کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے وہ ''یتیم کا خطاب ہلال سے'' ہے۔ اس نظم میں اقبالؔ نے ایک یتیم کی دکھ بھری داستان چاند کو مخاطب کر کے سُنانے کی کوشش کی ہے۔
یہ نظم سلیس اور سادہ لفظوں میں سوز و گداز اور دردمندانہ لہجہ میں بچوں کے جذبات اور احساسات کی عکاسی کرتی ہے۔

عید کا چاند آشکار ہوا　　تیر غم کا جگر کے پار ہوا
عید آئی ہے اے لباس کہن　　اب ترے چاک پھر سلائیں گے
اٹھ گئے قدرداں اپنے　　لکھ کے تختی کسے دکھائیں گے
سننے والے گذر گئے اے دل　　اپنے شکوے کسے سُنائیں گے

۱۹۰۲ء میں اقبالؔ نے انجمن حمایت اسلام میں اپنی آخری نظم ''تصویر درد'' پڑھی جو (۱۲۸) اشعار پر مشتمل ہے لیکن بانگ درا میں صرف (۶۹) اشعار اس کے انتخاب کئے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ نظم علامہ

کے ابتدائی کلام میں نہیں شامل کی جاسکتی لیکن اس کی خاص اہمیت کے لئے اس کو پیش کیا جاتا ہے۔اس نظم میں وطن کا حال زار، وطن سے پیار اور اقبال کا اضطراب نمایاں ہے۔ یہ وہی نظم ہے جس کو سن کر حالی نے دس روپے کا چندہ دیا اور خواجہ حسن نظامی نے اقبال کے سر پر اپنا عمامہ رکھ دیا۔

اس نظم کے چند اشعار پر ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

رولاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستان مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

علامہ اور خواجہ نظامی کی اسرار خودی پر قلمی جنگ

علامہ اقبالؔ اور خواجہ حسن نظامی میں قدیم دوستی اور پُر خلوص یارانہ تھا جو زیادہ مدت تک برقرار نہ رہ سکا۔ خواجہ صاحب حضرت نظام الدین اولیا کے متولی اور انجمن صوفیان ہند کے سکریٹری تھے آپ مجلّہ توحید اور صوفی کے مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کے عظیم نثر نگار بھی تسلیم کئے جاتے تھے چنانچہ آپ کی نثر نگاری کی تعریف میں ایک بار علامہ نے فرمایا تھا "اگر میں خواجہ نظامی کی طرح سے نثر لکھنے کا ہنر رکھتا تو ہرگز شاعری کو اپنے افکار کے اظہار کا وسیلہ نہیں بناتا"۔ خواجہ صاحب علامہ سے بہت محبت کرتے تھے اور جب کبھی علامہ کا قیام دہلی میں ہوتا تو ان کے لئے قوالی کی محفل سجاتے کیوں کہ علامہ قوالی کے دلدادہ تھے۔ جب ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں علامہ نے اپنی نظم نالہ یتیم پڑھی تو خواجہ صاحب اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے علامہ کے سر پر اپنا عمامہ رکھ دیا۔ علامہ کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ آپ انگلستان کے قیام کے دوران خواجہ صاحب سے فلسفہ تصوّف، اور علم لدنی کے بارے میں استفسار کرتے رہتے تھے۔ مکاتب اقبالؔ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ان دونوں شخصیتوں میں خلوص محبت اور یارانہ تھا۔ علامہ اقبالؔ کی پہلی فارسی مثنوی "اسرار خودی" کا نام خود خواجہ حسن نظامی نے انتخاب کیا تھا اور اس کے چیدہ چیدہ اشعار خواجہ نے اپنے ہفتہ وار "توحید" میں اگست ۱۹۱۳ میں شائع کئے تھے۔ لیکن اُسی دوران زمانے کے حالات ایسے بدلے کہ یہ دو جگری دوست ایک دوسرے کے سخت مخالف ہو گئے جس کی وجہ ذاتیات اور حسادت نہ تھی بلکہ مسائل تصوّف اور فلسفہ اسلامی کے سمجھنے میں تضاد اور سوئے تفاہم تھا۔ اسی لئے تو خواجہ نے اس قلمی جنگ کے دوران کہا تھا کہ "میں اقبالؔ کی نیک نیتی پر اس لئے شک نہیں کرتا کہ اسکا دوست ہوں بلکہ اُس کو میں عظیم انسان سمجھتا ہوں کیوں کہ میں اس کے افکار اور نیت خدمت اسلام سے باخبر ہوں"۔ مثنوی اسرار خودی کو جو اُس نے مسلمانوں کے فائدے کے لئے لکھا ہے وہ اس کی غلط فہمی ہے۔ یہ مثنوی حقیقت میں مسلمانوں کے عقاید اور اُصولوں کو کمزور اور متزلزل کرے گی۔ علامہ اقبالؔ اور خواجہ نظامی میں یہ جنگ قلمی تقریباً تین سال جاری رہی یعنی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک میدان

تحریر اور تقریر میں یہ دونوں لشکر فکری اور عقلی بحثوں میں مشغول رہے۔ خواجہ حسن نظامی کے لشکر میں مولانا سلیمان پھلواری، اکبر الہ آبادی، مہاراجہ کشن پرشاد، ذوقی شاہ اور کئی صوفی و خانقاہ نشین شامل تھے جب کہ علامہ کے ہمراہ سراج الدین پال، مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالہ عمادی، مولوی الف دین، مولوی محمود علی اور عبدالرحمان بجنوری قابل ذکر ہیں۔ ان افراد کے علاوہ کئی لوگ مستعار ناموں کے ذریعہ دونوں طرف سے اس میدان بحث میں شریک ہوئے جن میں کشاف، نقاد، ایک مسلمان، ایک فلسفی وغیرہ مستعار نام قابل ذکر ہیں۔ روزنامہ وکیل، مجلہ توحید، سراج الاخبار، مجلہ خطیب اور اُسوہ حسنہ کے علاوہ زمیندار ان بحثوں کے میدان تحریر ثابت ہوئے۔ اگرچہ یہ جنگ قلمی ۱۹۱۴ء کے جلسہ انجمن حمایت اسلام میں علامہ اقبال کے خطبہ ''تصوف عجمی اور اسلام'' سے شروع ہوئی جس میں علامہ نے تصوف عجمی کو اسلام اور دین کی روح کے مغائر بتلایا اور کہا کہ اس قسم کا تصوف خودی کو تباہ کر دیتا ہے۔ اگرچہ ادبیات تصوف میں خودی کو ''انا'' غرور اور تکبر کے معنی میں بیان کیا گیا ہے اور چونکہ یہ صفات پسندیدہ نہیں ہیں اس لئے مسلمانوں کو اس سے دوری کی تاکید کی گئی ہے، لیکن صوفیوں اور خانقاہ نشینوں نے خودی کو ''انا'' اور ''خود'' کے معنی میں استعمال کیا اور ''نفسِ خودی'' کی نفی کو اپنا شعار بتایا تا کہ معرفت کے مرتبہ پر فائز ہو سکیں۔ یہ ''نفی ذات'' علامہ کے نظریہ کے تحت اسلامی اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان نہ صرف اپنی خودی کو قائم رکھے بلکہ اس میں ارتقا کے درجوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ علامہ اقبال سے معرکہ آرائی کی اصلی وجہ اسرار خودی کا دیباچہ تھا جس میں انہوں نے حافظ شیرازی پر تنقید کی تھی اور دوسرے اس کتاب کا انتساب تھا جو سر سید علی امام کے نام تھا جسے لوگ سرشناس دولت مند افراد کی خوشامد تصور کرتے تھے۔ اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں علامہ نے گیارہ اشعار حافظ شیرازی کی فکری تنقید پر شائع کئے جس کے پانچ شعر یہ ہیں۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار　　جامش از زہر اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازار او　　از دو جام آشفتہ شد دستار او
آن فقیہ ملت مے خوارگان　　آں امام امت بے چارگان

دلربای ہای او زہر است و بس چشم او غارت گر شہراست و بس
بی نیاز از محفل حافظ گذر الحذر از گوسفنداں الحذر

(ترجمہ) حافظ شرابی سے ہوشیار رہیں کہ اُس کا پیمانہ زہر سے لبریز ہے۔ اُس کے بازار میں شراب کے سوا کوئی دوسری جنس نہیں ہے اور اسی لئے اُس کی دستار فضیلت سرمستی سے پریشان ہے۔ وہ شرابیوں کا فقیہی اور بے چارہ قوموں کا امام ہے۔ اُس کی دل ربائی زہر ہے اور اُس کی نظر شہر فکر کی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ حافظ کی محفل سے بے نیاز رہو اور خبردار بھیڑوں کے مندوں کی طرح زندگی بسر نہ کرو۔

ان اشعار کا شائع ہونا تھا کہ ادبی، علمی، تصوفی اور اسلامی حلقوں میں ہلچل مچ گئی جس کا ذکر آئندہ ہم اس مضمون میں کریں گے، چنانچہ اسرار خودی کے دوسرے ایڈیشن سے اقبال نے ان اشعار کو نکال دیا اور ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء کے خط میں حافظ محمد اسلم کو لکھا کہ "ان اشعار کے لکھنے کا مطلب صرف ادبی اصولوں کی توضیح اور تشریح تھی وگرنہ میرا حافظ کی شخصیت اور ان کے اعتقادی مسائل سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں حافظ شیرازی کو دنیا کے بہترین شعراء میں شمار کرتا ہوں، بہر حال کیوں کہ ان اشعار سے سوئے تفاہم پیدا ہو رہا تھا اس لئے میں نے ان اشعار کو حذف کر دیا ہے"۔

اسرار خودی کی قلمی جنگ کے آغاز میں پہلے خواجہ حسن نظامی نے اپنے دوست ذوقی شاہ کے ذریعہ علامہ کے خلاف ایک مقالہ ۳۰ نومبر ۱۹۱۵ء کو مجلہ خطیب میں شائع کروایا جس میں اس بات پر تاکید تھی کہ تصوف اسلام اور روح اسلام ہے۔ ہمارا ہدف اور مقصد صرف اللہ ہے اور کوئی چیز غیر اللہ حتیٰ کہ تسخیر دنیا بھی اسلامی مقصد اور ہدف نہیں بن سکتی۔ حافظ شیرازی کی شان میں گستاخی اور مخالفت خدا کے محبوب بندوں سے اختلاف ہے جو خود خدا کی مخالفت ہے۔ اس مقالہ کا جواب اقبال کے ایک حامی نے مستعار نام کشاف کے ذریعہ روزنامہ وکیل میں ۲۲ دسمبر ۱۹۱۵ء کو شائع کیا اور بتلایا کہ اس تحریک کی پشت پناہی خواجہ نظامی کر رہے ہیں اور یہ مقالہ اُنہی کا لکھا ہوا ہے جس میں انھوں نے اقبال کے نظریہ کو غلط بیان کیا ہے چنانچہ اسی لئے تو عالمگیر نے عوام کو دیوان حافظ کے مطالعہ سے باز رکھا تھا۔ کشاف نے لکھا کہ جس طرح انقلاب فرانس میں وہاں کے شعراء اور یونان میں لارڈ بایرن نے عوام

میں انقلابی روح بیدار کی اُسی طرح علامہ کی شاعری مسلمانوں میں خودی کو بلند اور برتر رکھنے میں سازگار ثابت ہوگی۔ ان مقالات کے بعد خواجہ نظامی میدان بحث میں اتر پڑے۔ انھوں نے مشاہیر علما اور مشائخ کو سوالات لکھ کر جواب طلب کئے اور بڑے آب وتاب کے ساتھ مختلف اخبارات اور مجلّہ جات میں شائع کروایا۔ جن افراد کے پاس سوالات روانہ کئے گئے تھے اُن میں سے اکثر افراد نے اسرار خودی کا مطالعہ بھی نہیں کیا تھا جن میں اکبرالہ آبادی بھی شامل تھے۔ سوالات کی فہرست کچھ اس طرح تھی۔ کیا قرآن مجید نے وحدت الوجود کی مخالفت کی ہے؟ کیا توحید اور وحدت الوجود دو جداگانہ چیزیں ہیں؟ کیا حافظ شیرازی کی طرح بعض اصحاب رسولؐ حالت سکر میں نہ تھے؟ اسلام میں تصوّف کا مقصد اور ہدف کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ ان سوالوں کے تمام جوابات علامہ کی مخالفت اور خواجہ نظامی کی موافقت میں تھے اِسی لئے خواجہ صاحب کے حامیوں کا دائیرہ روزانہ وسیع تر ہوتا گیا۔ خواجہ صاحب نے لکھا کہ اگر حافظ کا کلام مسلمانوں کو بُزدل اور ناکارہ بنا دیتا ہے تو کیا اصحاب رسولؐ جنھوں نے دین کو دنیا پر مقدم جانا بڑی بڑی فتوحات انجام نہیں دیں۔ کیا اس فلسفہ میں مغربی فلاسفروں کی روح بول نہیں رہی ہے؟ اگر چہ میں اقبال کا دشمن نہیں ہوں لیکن میری قدیم دوستی بھی صحیح عقاید کو بیان کرنے میں حائل نہیں ہوسکتی۔

۲۴ رجنوری ۱۹۱۶ء کو سراج الاخبار جہلم میں ایک مستعار نام فلسوف مسلمان نے اقبال پر الزام لگایا کہ وہ حافظ کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ حافظ کا تصوّف قرآنی اصولوں سے جدا نہیں ہے۔ اقبال کی فکر

ناچنانہ آئے آنگن ٹیڑھا کی مصداق ہے

ان مقالات کا جواب اقبال کے دوسرے حامی مولوی الف دین نے دیا جو وکیل اخبار میں شائع ہوئے پھر ایک طولانی مضموں خواجہ حسن نظامی کی جانب سے ۳۰ رجون ۱۹۱۶ء کو مجلّہ خطیب میں شائع کیا گیا جس میں انھوں نے مثنوی اسرار خودی کو مسلمانوں کے لئے مضر اور غیر معقول بتاتے ہوئے چند وجوہات لکھیں جو تحریف اور غلط تفسیر کے ذریعہ عوام کو علامہ کے خلاف ورغلانے کے لئے تھیں۔ خواجہ صاحب نے بتلایا کہ (۱) علامہ نے جو اشعار خودی کی حفاظت اور ترقی کے لئے بیان کئے ہیں وہ کوئی

نئی چیز نہیں ہے بلکہ قرآنی تعلیمات میں اس سے زیادہ اس مسئلہ پر مواد موجود ہے چنانچہ قرآن کو رکھتے ہوئے ہمیں مثنوی اسرار خودی کی ضرورت نہیں ہے (۲) اقبال مسلمانوں کو یورپ کے فلاسفروں کے فلسفے کی پیروی کرنے کی تعلیم دے رہے ہیں جو غلط ہے (۳) اسرار خودی کے مقدمہ میں اقبال نے فلسفہ وحدت الوجود اور صوفیانہ عقاید پر انتقاد کیا ہے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ صوفیوں کو نابود کیا جائے اور چونکہ یہ مہم کامیاب نہیں ہو سکتی اس لئے اس مثنوی کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

اس قلمی جنگ سے قبل علامہ نے ایک خط میں خواجہ صاحب کو لکھا تھا کہ انھوں نے مولانا روم کو خواب میں دیکھا اور مولانا نے انھیں اسرار خودی لکھنے کی تاکید کی ہے چنانچہ اس تحریر سے فایدہ اٹھا کر خواجہ صاحب نے لکھا کہ اقبال نے مولانا روم کو خواب میں تو دیکھا لیکن ان کی مثنوی کو بیداری میں نہیں پڑھا کیونکہ اگر وہ مثنوی پڑھتے تو کبھی یہ مثنوی نہیں لکھتے۔ جب اتہام اور الزامات کا بازار ہر طرف سے گرم ہوا تو علامہ اقبال نے اپنی صفائی اور اسرار خودی کی تائید میں ایک مقالہ خواجہ صاحب کے جواب میں "راز اسرار خودی" لکھا جو ۹ر فبروری ۱۹۱۶ء کو اخبار وکیل میں شائع ہوا جس میں علامہ نے مفصل بحث کر کے خواجہ صاحب کے تمام تر سوالات کے جوابات لکھے اور اسرار خودی کو مسلمانوں کے لئے ایک مفید کتاب بتلایا اور اسرار خودی کا انتساب سر سید علی امام کے نام امیروں کی خوشامد اور لالچ نہیں بلکہ اُن سے اظہار محبت اور دوستی کی دلیل نامزد کیا۔

۲۸ر جون ۱۹۱۶ء کو اخبار وکیل میں علامہ نے ایک مقالہ علم ظاہر و علم باطن کے عنوان سے شائع کیا اور اس میں صوفیوں میں پھیلے ہوئے سوئے تفاہم کو کم کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ جس تصوف سے اصل اور قوانین اسلام میں پایداری اور خلوص پیدا ہوتا ہے وہ اسلام کے خلاف نہیں بلکہ عین اسلام ہے۔ اس کے علاوہ اقبال نے تین مقالے "تصوف وجودی" پر لکھے جس میں ایک مقالہ روز نامہ وکیل میں ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۶ء کو شائع ہوا۔ علامہ نے انگریزی میں بھی ایک مکالمہ اسلام اور تصوف لکھا جو جنوری ۱۹۱۷ء کے میگزین New Era میں شائع ہوا۔ علامہ اقبال نے ان مقالات کے علاوہ خطوط کے ذریعے اکبر الہ آبادی، سید سلیمان ندوی، مہاراجہ کشن پرشاد، اور دیگر مشاہیر علماء سے یہ استدعا

کی کہ قبل از ہر گونہ اعتراض ان کی مثنوی کا مطالعہ کریں۔ چنانچہ ۲۰ر جنوری ۱۹۱۸ء اور ۱۱ر جون ۱۹۱۸ء کو اکبر الہ آبادی کو لکھتے ہیں کہ میرا اعتراض حافظ شیرازی پر ادبی تنقید ہے۔ جدید علوم اسلام کے دشمن نہیں ہیں بلکہ اصلی دشمن مسلمانوں کی وطن پرستی یا Nationalism ہے جس کی وجہ سے ترکی خلافت ختم ہوئی۔ اسلام کا مسئلہ اسلامی ایک قوم کا تصور ہے جس کا مرکز کعبہ ہونا چاہیے۔ اقبال نے یہ بھی لکھا کہ آپ نے مجھ پر الزام لگایا جو صحیح نہیں ہے۔ آپ سے یہ میری التجا ہے کہ کم از کم ایک بار اسرار خودی کا مطالعہ کریں اور پھر اظہار نظر دیں۔ جس طرح شبلی کے پتھر سے منصور کو زخم لگا اور تکلیف ہوئی اسی طرح آپ کے اعتراض سے مجھے اذیت پہنچی ہے۔

۲۴ر جون ۱۹۱۶ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں کہ مجھے اس بات کا تعجب ہے کہ آپ بھی خواجہ صاحب کے ہم خیال ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے اپنی مثنوی میں جرمنی فلسفہ کے سوا کوئی چیز جدید پیش نہیں کی۔ اگر کوئی شخص فلسفہ وجودی کا مخالف ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ تصوف کا مخالف ہے۔ مجھے حقیقی تصوف اسلامی سے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن بہر حال تصوف وجودی کا دین سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اکبر الہ آبادی اقبال اور حسن نظامی کی عظمت کے قایل تھے چنانچہ انھوں نے اس قلمی جنگ کی آگ بجھانے کی دونوں کو تاکید کی۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی خارج از محل نہیں کہ ۱۹۲۰ء میں پروفیسر نیکلسون نے لندن میں اسرار خودی کا ترجمہ شائع کیا۔ نیکلسون نے دیباچہ میں لکھا کہ اقبال کے احساسات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک پر احساس مسلمان ہے جو اسلام سے خلوص رکھتا ہے وہ ایک ایسی حکومت اسلامی کا قائل ہے جس میں قومی اور ملی بندش نہ ہو اس کا مقصد ایک عظیم اسلامی حکومت کی بنیاد گذاری ہے جس کا مرکز کعبہ اور جس کا ایمان خدا اور رسولؐ پر ہو۔ ایک مشہور انگریزی نقاد Dixon نے اسرار خودی کے ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اقبال کے انسان کامل فلسفہ جرمن کے فلاسفر نیچے اور فرانس کے دانشمند برگسون کے خیالات کا نچوڑ ہے۔ یہ فلسفہ ایک مخصوص اور محدود طبقہ سے تعلق رکھتا ہے یعنی یہ فلسفہ پسماندہ اقوام اور خصوصی طور پر مسلمانوں کو جنگ کا سبق دیتا ہے اور اس فلسفہ کا ہر لفظ سیاسی قدرت اور طاقت سے لبریز ہے۔

علامہ اقبالؔ نے Dixon کے جواب میں لکھا کہ اگرچہ میرا فلسفہ عالمگیر ہے اور محدود نہیں کیوں کہ انسانی دوستی شاعری اور فلسفہ میں ہمیشہ جہانی رہی ہے مگر اگر کوئی انسان اِن مسائل کو ایک جامعہ میں پورا کرے تو وہ جامعہ ایسا ہونا چاہئے کہ وہ ان اقدار کو پوری طرح سے اپنے میں جذب کرنے کی قدرت رکھے اور وہ صرف جامعہ اسلامی ہی ہوسکتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ فلسفہ اسرار خودی کو میں نے اسلامی حکیموں اور صوفیوں سے حاصل کیا ہے چنانچہ برگسون کا یہ کہنا کہ یہ مغربی فلاسفروں کی دین ہے غلط ہے، بدبختی یہ ہے کہ مغربی افراد فلسفہ اسلامی سے بے خبر ہیں۔

اسرار خودی کے انگریزی ترجمے پر ۲۵ راگست ۱۹۲۱ء کو امریکہ کے اخبار Newage میں تبصرہ کیا گیا اور بتایا گیا کہ یہ مثنوی ہندوستانی مسلمانوں میں محشر برپا کردے گی۔ تمام مغربی ممالک میں اگرچہ اسرار خودی پر تبصرے ہوئے لیکن اسلامی ممالک بالکل خاموش رہے کیوں کہ وہاں کے حکمران اس کو اپنے مفاد کے خلاف جانتے تھے اِسی لئے تو علامہ نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا کہ ''میں نے جس ملّت کے لئے اس مثنوی کو لکھا اُس نے اِسے بالکل نظر انداز کر دیا یا پھر توجہ کے ساتھ نہیں پڑھا اور نہ اس کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی، مگر دوسری قومیں جن کے بارے میں اس میں بات چیت نہیں ہوئی اور جن کو میں نے مخاطب نہیں کیا اِس کا مقصد اور مفہوم سمجھنے میں آگے رہے چنانچہ اِسی لئے تو علامہ نے مہاراجہ کشن پرشاد کو خط میں اُن کے سر کے خطاب ملنے پر اس خطاب کی بڑی وجہ ان کی تخلیق اسرار خودی کا دوسری زبانوں میں ترجمہ اور اُس پر مفکران جہان کے تبصرے قلمبند کیا۔

ہم اس مضمون کو علامہ کے ہی شعر پر ختم کرتے ہیں۔

آشنا از لذّتِ گفتار شو　　اے درائے کاروان بیدار شو

علامہ اقبالؔ اور اکبرالہ آبادی

علامہ اقبالؔ، اکبرالہ آبادی کو اپنا پیرومرشد تصور کرتے تھے اور تہ دل سے اُن کی عزت واحترام کے قائل تھے۔ اگرچہ اکبرالہ آبادی عمر میں اقبالؔ سے (۳۱) سال بڑے تھے لیکن تفاوت عمر کے باوجود وہ اقبالؔ کو اپنا دوست اور غمخوار جان کر اپنے نجی اور خصوصی قلبی حالات سے آگاہ کرتے رہتے تھے اقبالؔ اور اکبرؔ کی جان پہچان انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں ہوئی جہاں اقبالؔ نے حالیؔ، شبلیؔ، گرامیؔ، خواجہ حسن نظامیؔ اور دیگر مشاہیر سے ملاقات کی تھی، لیکن ان دونوں ہستیوں میں مخلصانہ دوستی ۱۹۱۱ء سے شروع ہوئی جو دس سال یعنی اکبرؔ کی وفات ۱۹۲۱ء تک برقرار رہی۔ ''مکاتیب اکبرؔ'' کے ترتیب کار مرزا سلطان احمد کے دیباچہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ کے پاس اکبرؔ کے کئی خطوط موجود تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ ''سنا گیا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ بھی یہ آرزو رکھتے ہیں کہ حضرت اکبرؔ کے جو خطوط ان کے نام ہیں ان کا ایک انتخاب مع مقدمہ کے شائع کیا جائے۔ اگر ڈاکٹر صاحب ایسا کر سکیں تو وہ ادبی دنیا پر ایک بڑا احسان کریں گے''۔ افسوس کہ علامہ اکبرؔ کے انتقال کے بعد (۱۷) سال زندہ رہے لیکن یہ خطوط شائع نہ ہو سکے اور آج ان خطوط کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں۔ اس وقت ادب کے دامن میں صرف اکبرؔ کے پانچ خطوط بنام اقبالؔ موجود ہیں جن میں سے دو خط اقبالؔ نامہ اور تین خطوط اقبالؔ کے انتقال کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّہ ''راوی'' کے خصوصی ''اقبال نمبر'' میں شائع ہوئے تھے۔ البتہ اقبالؔ نے جو اکبرؔ کے نام خطوط لکھے اُن میں سے سولہ (۱۶) خطوط شیخ عطاءاللہ کے مرتب کردہ مجموعہ ''خطوط اقبالؔ نامہ'' حصہ دوم میں شامل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؔ نے اکبرؔ کے خطوط کو محفوظ کیا تھا جس کا ذکر خود اقبالؔ نے اپنے ۹ رنومبر ۱۹۱۱ء کے خط میں یوں کیا ہے۔ ''آپ کے خطوط جو میرے پاس محفوظ ہیں بار بار پڑھا کرتا ہوں اور تنہائی میں یہی خاموش کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ ارادہ کیا کہ آپ کی خدمت میں استدعا کروں کہ خط ذرا لمبا لکھا کیجئے مگر میں خود لمبا لکھنے سے گھبراتا ہوں۔ پھر میرا کوئی حق نہیں ہے کہ آپ کو لمبا خط لکھنے کی زحمت دوں''۔ اس کے علاوہ ۱۸/اکتوبر ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''آپ کے خطوط سے مجھے نہایت فائدہ ہوتا ہے اور

مزید غور و فکر کی راہ کھلتی ہے۔ اسی واسطے میں ان خطوط کو محفوظ رکھتا ہوں کہ یہ تحریریں نہایت بیش قیمت ہیں اور بہت لوگوں کو اُن سے فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔'' ۱۴ ستمبر ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ ابھی تو مسلمانوں کو اُن کے لٹریچر کو آپ کی سخت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے۔ ''زمانے'' کے اسی نمبر میں آپ کے اشعار بھی دیکھئے جن کو کئی دفعہ پڑھا ہے اور ابھی کئی بار پڑھوں گا بالخصوص اِس شعر نے۔ ع۔ جب علم ہی عاشق دنیا ہوا۔ بہت اثر دل پر کیا۔

اقبال ۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ ''میں آپ کو اُسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے''۔

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے ہے کوئی مشکل سی مشکل راز داروں کے لئے

علامہ کی آرزو ے ملاقات ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء کو پوری ہوئی جب وہ خواجہ نظامی اور مرزا جلال الدین کے ہمراہ کانپور کے دورے کے بعد اکبر الہ آبادی سے ملنے الہ آباد گئے اور پھر دہلی گئے اور حکیم اجمل خان سے ملاقات کی۔ اسی ملاقات کا ذکر اکبر نے اپنے خط ۹ جنوری ۱۹۱۳ء میں اس طرح سے کیا ہے ''آپ کا تشریف لانا نہایت باعث انبساط قلب ہوا بہت افسوس ہوا کہ آپ کی تواضع و تکریم کا موقع نہ ملا لیکن اس سے زیادہ اس بات کا کہ مبادلہ خیالات کا موقع بہت کم ملا۔ خدا جزاے خیر دے''۔

اقبال اور اکبر کی ملاقاتیں اور نامہ نگاریاں دراصل دو عظیم مفکروں، دو اسلامی فلاسفروں اور دو عظیم شاعروں کی انجمن آرائیاں معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے اور ایک دوسرے کے اشعار کی داد دیتے اور لیتے ہوئے سرشار اور خوش نظر آتے ہیں۔ اکبر اپنے خط ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں لکھتے ہیں ''آپ کی نظم سوز میں نے پڑھی۔ ماشاء اللہ چشم بدور۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چشم بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اس عمر بلا تجربہ دنیا آپ کے دل کی نظر کم سے کم اخلاقی حقایق کی طرف ہے۔

کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر۔

کس قدر بلیغ وصحیح ولبریز معنی ہے۔ اگر چہ یہ لطیف وخوب صورت وبلیغ ترکیب الفاظ آپ کی علمی قابلیت اور خاص شاعرانہ سلیقہ کا نتیجہ ہے۔ الغرض جملہ شعر لاجواب ہیں"۔

اقبال نے ۱۷ر دسمبر ۱۹۱۴ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ کل خط لکھ چکا ہوں۔ مگر آپ کے اس شعر کی داد دینا بھول گیا۔

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں　　عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

سبحان اللہ۔ کس قدر باریک اور گہرا شعر ہے۔ آپ نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ میں بند کر دیا۔ ہیگل لکھتا ہے کہ اصول تناقض ہستی محدود کی زندگی کا راز ہے اور ہستی مطلق کی زندگی میں تمام قسم کے تناقض جو ہستی محدود کا خاصہ ہیں، گداختہ ہو کر آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔ اسی رنگ کے فلسفانہ اشعار اور بھی لکھیے کہ خود بھی لذت اٹھاؤں اور اوروں کو بھی اس لذت میں شامل کروں"۔

اقبال کبھی یوں رقم طراز ہیں۔

وہی نگاہ جو رکھتی ہے مست رندوں کو　　غضب یہ ہے کہ کبھی محتسب بھی ہوتی ہے

کئی دفعہ پڑھ چکا ہوں۔ اس کا لطف کم ہونے میں نہیں آیا۔ کبھی موقع ہوتا ہے تو دل کا دکھڑا آپ کے پاس روتا ہوں۔ (مکتوب ۲۵ر اکتوبر ۱۹۱۵ء)

اقبال ۲۵ر اپریل ۱۹۱۹ء کے خط میں اکبر کو لکھتے ہیں۔ "چند روز ہوئے ایک مصرع ذہن میں آیا تھا۔ دوسرا مصرع نہیں ہو سکا۔

ایں سر خلیل است با آذر نتواں گفت

غور فرمائیے۔ کچھ ذہن میں آئے تو مطلع کیجئے"۔

اکبر اور اقبال اولین ملاقات ہی سے ایک دوسرے کے لئے دل میں خاص جگہ رکھتے تھے۔ علامہ اقبال زعفران بھیجتے ہیں تو اکبر ۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۱ کے خط میں لکھتے ہیں۔ "تہ دل سے مشکور ہوں۔ خانہ احسان آباد۔ خوشی اس بات کی ہوئی کہ میرے روحانی دوست نے مجھ کو تحفہ عنایت فرمایا۔ اس خیال میں بڑی لذت ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ میرے اسلامی بھائی نے تحفہ بھیجا۔ یہ ایک شرعی بات ہے

اوران روزوں بڑے جھگڑے کی بات ہے''۔ اسی طرح جب اکبر نے اقبال کے لئے لنگڑے آموں کی پیٹی بھیجی تو اقبال نے اس تحفہ پر خوب صورت اشعار لکھ کر روانہ کیے۔

اگر اقبال اپنے دل کا دکھڑا اکبر کے سامنے روتے تو اکبر بھی اپنے دل کا حال اُن تک لفظ لفظ بیان کر دیتے تھے۔ ناقدین ادب اور محققین اقبالیات کہتے ہیں کہ اکبر سے ہی متاثر ہو کر اقبال نے ظریفانہ اشعار کہے جو آج ان کے مجموعہ میں موجود ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے ۳/مارچ ۱۹۱۲ء کے خط میں لکھا ''میرے ظریفانہ اشعار سے کبھی بہت زندہ دلی اور شوخی کا قیاس ہو سکتا ہے لیکن عادتاً وہ بھی ایک اسلوب ادائے خیال ہے۔ ورنہ بے حد افسردہ رہتا ہوں اور نہ بھی افسردہ رہوں تو ایک حسرت سی رہتی ہے''۔ یہ سچ ہے کہ اکبر کی یہ افسردگی آخری عمر میں اُن کے چھوٹے لڑکے ہاشم کے مرجانے سے بہت بڑھ گئی چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''مرحوم ہاشم کے ساتھ لٹریری دنیا کی ساری امیدیں ختم ہو گئیں۔ تین دن ہوئے بے ساختہ یہ اشعار ذہن میں آئے جن سے میری طبیعت کی مایوسی اور خون کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

وہ چمن ہی جل گیا جس میں لگائے تھے شجر — اب تجھے پا کر میں اے باد بہاری کیا کروں
صفحہ ہستی سے ہوا محو اپنا نقش زندگی — جب یہ مضمون پیش ہے مضمون نگاری کیا کروں
کہتے ہیں احباب کر دنیا میں اکبر کوئی کام — حسرت و حیرت مگر مجھ پر ہے طاری کیا کروں

۱۳۱۳ھجری میں جب اقبال کی والدہ کا انتقال ہوا تو اکبر الہ آبادی نے اس غم میں شریک ہو کر اشعار لکھے جو کلیات اکبر میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک قطعہ تاریخ فارسی مین لکھا جو مرحومہ کی سنگ قبر پر کندہ ہے۔

مادر مرحومہ اقبال رفت — سوی جنت زیں جہاں رفت
گفت اکبر بادل پردرد غم — رحلت مخدومہ ''تاریخ یافت'' (۱۳۱۳ھجری)

اگر اکبر الہ آبادی کی میاں جگری نہ ہوتی تو خواجہ حسن نظامی اور اقبال کی قلمی جنگ جو اسرار خودی کے دیباچہ اور حافظ کے متعلق اشعار سے شروع ہوئی تھی، کبھی ختم نہ ہوتی۔ اس طرح دونوں شخصیتوں کے

حامیوں میں یہ آتش زور پکڑتی جو ادب اور مذہب دونوں کیلئے نقصاں رساں اور نا قابل تلافی ضرر ثابت ہوتی۔ جب اقبالؔ نے اسرار خودی میں حافظؔ شیرازی پر اسلامی تصوفی نظریہ سے حملے کئے اور اس کی مخالفت میں خواجہ نظامی نے ایک محاذ قایم کیا اور اقبالؔ پر جوابی حملوں کی بوچھار کردی۔ اگرچہ اکبرؔ حافظؔ کی تائید میں نظامیؔ کے ہم آواز تھے لیکن وہ اقبالؔ کی نیک نیتی سے واقف تھے۔ اقبالؔ ۱۱ر جون ۱۹۱۸ء کے خط میں اکبرؔ کو لکھتے ہیں۔

''میں نے خواجہ حافظؔ پر کہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ اُن کے دیوان سے میکشی بڑھ گئی۔ میرا اعتراض حافظؔ پر بالکل اور نوعیت کا ہے۔ اور اسرار خودی میں جو کچھ لکھا گیا وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر ہے خواجہ حافظؔ کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار نہ تھا اور نہ ان کی شخصیت سے، نہ ان کے اشعار میں ''مے'' سے مراد وہ مئے ہے جو لوگ ہوٹلوں میں پیتے ہیں۔ بلکہ اُس سے وہ حالات سکر مراد ہے جو حافظؔ کے کلام سے بحیثیت مجموعی پیدا ہوتی ہے۔ معاف کیجئے گا مجھے آپ کے خطوط سے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مثنوی اسرار خودی کے صرف وہی اشعار دیکھے ہیں جو حافظؔ کے متعلق لکھے گئے تھے۔ کاش آپکو اُن کے پڑھنے کی فرصت مل جاتی تا کہ آپ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہتے۔

علامہ اس خط کے ۵ ہفتہ بعد ۲۰ر جولائی ۱۹۱۸ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''میری بدنصیبی یہ ہے کہ آپ نے مثنوی کو اب تک نہیں پڑھا۔ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محترز رہنے کے لئے میری خاطر سے ایک دفعہ پڑھ لیجئے۔ جس طرح منصور کو شبلی کے پتھر سے زخم آیا اور اُس کی تکلیف سے اُس نے آہ وفریاد کی اسی طرح مجھ کو آپ کا اعتراض تکلیف دیتا ہے''۔

اکبرؔ نے ایک طرف اپنے ارشادات سے خواجہ حسن نظامیؔ کو وادار کیا کہ وہ شخصیت پر حملہ کرنے سے گریز کریں اور فلسفہ وحدت الوجود کے لئے قرآن سے استناد پیش نہ کریں تو دوسری طرف اقبالؔ سے کہا کہ وہ حافظؔ پر جارحانہ حملے اور تصوف کے خلاف تند تحریروں سے باز رہیں۔ چنانچہ اقبالؔ نے حافظؔ سے متعلق سخت اشعار اور دیباچہ کے سخت و تند جملوں کو اسرار خودی کے دوسرے ایڈیشن سے

حذف کر دیا۔ اس قلمی جنگ کی ابتدا میں اکبر نے حسن نظامی کو لکھا۔

حضرت اقبال اور خواجہ حسن — پہلوانی اُن میں اِن میں بانکپن
جب نہیں ہے زور شاہی کے لئے — آؤ گتھ جائیں خدا ہی کے لئے
درزشوں میں یہ تکلف ہی سہی — ہاتھا پائی کو تصوف ہی سہی
ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص — می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

لیکن جب دونوں میں یہ معاملہ بڑھ گیا تو حسن نظامی کو یوں مشورہ دیا۔

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد — قومی رکنوں کے ہیں نگہباں، وہ بھی
تم محو ہو حُسن کی تجلّی میں اگر — ہیں دشمنِ فتنہ رقیباں وہ بھی

بہر حال یہ اکبر الہ آبادی ہی کی کوشش تھی کہ پھر یہ دو دل ایک دوسرے سے جڑے رہے۔

اس مضمون کے اختتام پر ہم علامہ اقبال کے اکبر کی وفات پر ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء پر تاثرات بیان کرتے ہیں جو اقبال کے دل میں اُن کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔

''اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بڑی بخیل ہے زمانہ سیکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب جا کے ایک اکبر اُسے ہاتھ آتا ہے۔ کاش اس انسان کا معنوی فیض اس بدقسمت ملک اور اس کی بدقسمت قوم کے لئے جاری رہتا''۔

علامہ اقبالؔ اور مہاراجہ سر کشن پرشادؔ

مہاراجہ کشن پرشادؔ، مہاراجہ نریندر بہادر کے فرزند اور مہاراجہ چندو لال بہادر کے پوتے تھے، جن کے جد راجہ ٹوڈرمل شہنشاہ اکبر کے وزیر مالگواری تھے جن کا اصلی وطن لاہور تھا۔ مہاراجہ خوش اخلاق ادب نواز اور گنگا جمنی تہذیب کے علم بردار تھے۔ آپ کہنہ مشق صاحب دیوان شاعر تھے اور شادؔ تخلص کرتے تھے۔ اُردو اور فارسی میں نعتیہ اشعار بھی کہتے تھے۔ آپ کی نعتوں کا مجموعہ آپ کی زندگی ہی میں شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا تھا۔ آپ کے کچھ نعتیہ اشعار آج بھی مسجد نبویؐ سے مسلکہ شیخ الاسلام کتب خانہ کی دیوار پر نقش ہیں۔ مہاراجہ کو اُردو کے علاوہ انگریزی اور مقامی زبانوں پر کافی عبور حاصل تھا۔ مہاراجہ سپاہ گری، علم رمل، علم نجوم، خطاطی، نقاشی کے علاوہ موسیقی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ کی سالانہ جاگیر (۱۶) لاکھ روپیوں سے متجاوز تھی۔ دیوڑھی اشرافانہ تھی لیکن عادت فقیرانہ اور درویشانہ۔ مہاراجہ کی چار مسلمان بیویاں اور تین ہندو بیویاں تھیں۔ مسلمان بیوی کی اولاد کو مسلمان طریقے سے پرورش کرتے اور اُن کے لیے مسلمان گھروں میں رشتے کرتے تھے۔ ہندو بیوی کی اولاد کو ہندو طریقے سے پرورش کر کے ان کے لیے ہندو گھروں میں رشتے قائم کرتے۔ خود مسجد بھی جاتے اور سورھائی قرانی کی تلاوت کرتے اور مندر بھی جا کر عقیدت کا اظہار کرتے۔ آپ کی زندگی کے آخری دور میں افواہ پھیلی تھی کہ مہاراجہ مسلمان ہو چکے ہیں لیکن یہ بات غلط تھی چنانچہ کسی مقام پر حضورؐ نظام کو مخاطب ہو کر کہا تھا

تو خدا پرشاد ہے میں کشن پرشاد ہوں

موصوف کی وصیت کے مطابق ۱۹۴۰ء میں انتقال کے بعد اُن کی آخری رسومات ہندو طریقے پر انجام دی گئی اور اُن کے بیٹے خواجہ پرشاد جو ہندو بیوی کے بطن سے تھے اُن کے جانشین قرار دئے گئے جن کو کچھ عرصے بعد ایک انگریز سپاہی نے اُس کی معشوقہ سے روابط رکھنے کی وجہ سے بمبئی میں تاج محل ہوٹل کے اوپری طبقہ سے پھینک کر قتل کر ڈالا۔

کچھ عرصے قبل میری ملاقات نواب معین جنگ بہادر کے پوتے نواب تقی خان صاحب سے شمالی امریکہ میں ہوئی جنھوں نے مختلف حقایق پر روشنی ڈالتے ہوئے مہاراجہ کے بڑے فرزند نواب اسد اللہ خان کی شادی جو نواب داؤد جنگ کی چھوٹی لڑکی قیصر النساء بیگم سے ہوئی اُس کی تفصیلی روداد فرمائی جو مکمل طور پر ایک مسلمان اشرافی خاندان کے گھر کی شادی کی تصویر تھی۔ علامہ اقبال اور مہاراجہ کے تعلقات کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ مہاراجہ کے جد کا تعلق پنجاب کی سرزمین سے ہونے کے علاوہ، مہاراجہ اقبال کی طرح فقیر انہ عادت اور درویش صفت اوصاف اور صوفیانہ خیالات سے ہمکنار تھے اقبال کی طرح مہاراجہ بھی داغ دہلوی کے اُن شاگردوں میں شامل تھے جن پر داغ کو فخر تھا۔ اقبال کی طرح مہاراجہ بھی اُردو اور فارسی میں اشعار کہتے اور مہاراجہ کو بھی حضورِ اکرم سے بے نہایت محبت اور عقیدت حاصل تھی جو اُن کے مجموعہ گلبن نعت سے ظاہر ہے۔ مہاراجہ علامہ اقبال کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے اور قدر دانی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ علامہ اقبال پر نادان مولویوں اور دانا متعصب ہندوؤں کے اعتراضات کا طوفان تمام برِ صغیر میں پھیلا ہوا تھا۔ نادان مولویوں جن کی ایک معمولی مثال مولوی دیدار علی خطیب مسجد وزیر خان کا فتوی ہے جس میں انھوں نے علامہ اقبال کو کافر اور مسلمانوں کو علامہ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے یا اُن کے معاشرت برقرار رکھنے کو عظیم گناہ قلمبند کیا تھا۔ دوسری طرف اردو معلّٰی کے حامیوں کی آڑ لے کر چند دانا ہندو ادیب جن میں برق ملسانی کے والد جوش ملسانی سرفہرست ہیں جنھوں نے مستعار نام حضرت جرآح کے نام کے ساتھ اقبال کی زبان دانی اور اُن کے کلام کی فنی غلطیوں پر لاہور کے اخبار "پارس" میں مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ مجلّہ اُردو معلّٰی میں حسرت موہانی اور برج نرائین چکبست لکھنوی کے علاوہ پنچ اودھ اخبار میں دیگر قابل افراد نے بھی علامہ اقبال کی بڑھتی ہوئی شہرت سے حسد کر کے علامہ کے کلام کو غلط اعتراضات کا نشانہ بنایا۔ ایک اور محاز پر شادی لعل جیسے افراد علامہ کے قلم سے رواں طوفان کو روکنے میں شبانہ روش مصروف تھے بہر حال ان حالات میں مہاراجہ کی مکمل ہمدردی علامہ اقبال کے ساتھ تھی اور اسی لیے یہ دوستانہ تعلقات اتنے گہرے ہو گیے تھے کہ مرا سلاتی تحریروں سے ہمیں پتہ

چلتا ہے کہ مہاراجہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیوں میں بھی علامہ اقبال سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ۱۳ر جنوری ۱۹۱۳ء کو مہاراجہ لاہور تشریف لائے۔ اقبال تمام مدت مہاراجہ کے ساتھ رہے۔ لاہور میں قیام کے دوران مہاراجہ نے محسوس کیا کہ اقبال تنگ دستی کا شکار ہیں کیونکہ تین بیویاں اور دو بچوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ زمانے کی نیرنگیاں اقبال کو نشانہ بنائی ہوئیں ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد پہنچ کر فوراً اقبال کی معاشی حالت کو بہتر کرنے کا بندوبست کیا۔ ہمیں معلوم نہ ہوسکا کہ مہاراجہ نے کیا مبلغ یا پیشکش اقبال کے لیے کی لیکن اقبال کے خط سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اِسے قبول نہیں کیا اور واپس کر دیا۔ اُن کے اُس خط کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ "مجھے معلوم نہیں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ دوست نوازی اور غریب پروری آپ کا خاندانی وطیرہ ہے۔ آپ کا یہ فیض مجھے ایک لمحے میں ثروت مند کر دے گا لیکن میری طبیعت اور میری دیانت داری کا یہ تقاضہ نہیں کہ اُجرت تو آپ سے حاصل کروں اور اُس کے مقابل آپ کا کوئی کام نہ کرسکوں۔ ہمیشہ کی طرح اقبال آپ کا معنوی دوست ہے اور رہے گا۔ آپ نے جو اپنے صمیم قلب سے محبت کی ہے وہ ہمیشہ دوستی کی تاریخ میں یادگار رہے گی"۔

فطرت انسانی کا تقاضہ ہے کہ انسان اپنے غم اور دکھ صرف اُسی شخص سے بیان کرتا ہے جسے اُس سے محبت اور ہمدردی ہو۔ ۹ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اقبال کی والدہ امام بی نے انتقال کیا اُس وقت اقبال کی عمر (۳۷) سال تھی۔ ذکر اقبال کے مصنف عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ جب میں پرسہ دینے کے لیے اقبال کے گھر گیا تو میں نے دیکھا کہ اقبال اپنی ماں کو یاد کر کے اس طرح رو رہے تھے جس طرح ایک نابالغ فرزند اپنی ماں کو روتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی خارج از محل نہیں کہ جناب اکبر الہ آبادی نے علامہ کی والدہ کی وفات پر فارسی میں قطعہ تاریخ وفات لکھا جو مرحومہ کی قبر پر کندہ ہے۔

بہر حال پڑسے کے خط کا جواب علامہ کی طرف سے مہاراجہ سے اُن کے گہرے تعلقات کی دستاویز ہے۔ حکومت انگلستان نے ۱۹۲۳ء میں علامہ اقبال کو سر کا خطاب دیا، علامہ نے مہاراجہ کو خط کے جواب میں لکھا کہ یہ خطاب مجھے حکومت انگلستان نے اسرار خودی کے اشعار سے متاثر ہو کر دیا ہے

جس پر انگریزی زبان مین ترجمہ ہونے کے باعث یورپ اور امریکہ میں کئی تبصرے شائع ہوئے ہیں جب ہندو مسلمان فسادات کے شعلے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے اور پنجاب بھی اُس کی زد میں شعلہ ور تھا اُس وقت ۱۹ر مارچ ۱۹۲۳ء کو علامہ اقبالؔ نے مہاراجہ کو خط میں لکھا کہ افسوس کی بات یہ ہے کہ پنجاب میں بھی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور عداوت اپنی اوج پر پہنچ چکی ہے اور اگر یہی حال جاری رہے تو آیندہ (۳۰) سالوں میں ان ملتوں کا مل کر زندگی کرنا بہت دشوار ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ کی یہ پیشن گوئی بھی بالکل صحیح نکلی چنانچہ اس یادداشت کے کوئی (۲۵) سال بعد برصغیر میں پاکستان کا وجود عمل میں آیا۔ علامہ اقبالؔ کے انتقال کے کوئی تین مہینے قبل جنوری ۱۹۳۸ میں وزیر آعظم حیدرآباد دکن سر اکبر حیدری نے ایک ہزار روپیہ کا چیک بھیجا جو یوم اقبالؔ کے موقع پر توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے دیا گیا۔ ایک ماتحت افسر کی غلطی کے سبب سے چیک کے ہمراہ یہ لکھا گیا کہ یہ رقم زکوٰۃ کی مد سے دی گئی۔ چنانچہ علامہ نے اس چیک کو واپس کرتے ہوئے چار اشعار بھیجے جس کے آخری دو اشعار یہ ہیں۔

میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول

کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
جب کہا اُس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

علامہ اقبال اور حیدرآباد دکن

تاریخی دستاویز کے بموجب علامہ اقبال ۱۹۱۰ء اور ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ حیدرآباد کے دیدار کی خواہش اقبال کو نوجوانی کے زمانے سے تھی چنانچہ ۱۸۹۹ء میں علامہ اقبال نے کہا تھا "اگر شوق دیدار حضرت داغ اسی طرح رہا تو میں حتماً ایک دن ملکِ دکن کا سفر ضرور کروں گا"۔ اقبال نے حیدرآباد دکن کا دو بار سفر تو کیا لیکن حضرت داغ سے ملاقات کی سعادت حاصل نہ ہو سکی کیونکہ داغ دہلوی مرحوم ہو چکے تھے۔

علامہ اقبال پہلی بار ۱۸/ مارچ ۱۹۱۰ء کو حیدرآباد آئے۔ حیدرآباد کے عوام اور خواص جن میں ادبی سماجی اور سیاسی ممتاز افراد بھی شامل تھے علامہ اقبال کے نام اور پیام و کلام سے واقف تھے کیوں کہ اقبال کا کلام دکن کے مجلّہ جات اور اخبارات میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ علامہ اقبال کی سر اکبر حیدری (وزیر آعظم ۱۹۳۸ء۔۱۹۴۸ء) مہاراجہ کشن پرشاد (وزیر آعظم اور کمانڈر ان چیف) سے نامہ نگاری بھی تھی۔ اس کے علاوہ اُردو اور فارسی کے مشہور شاعر جناب غلام قادر گرامی مقیم حیدرآباد سے دوستانہ روابط برقرار تھے۔ اُس زمانے میں نواب میر محبوب علی حیدرآباد دکن کے حکمران تھے جن سے علامہ اقبال کی ملاقات نہ ہو سکی۔ اس بارے میں ۳۰/ مارچ ۱۹۱۰ء کے خط میں علامہ نے جو حیدرآباد کے قیام کے دوران عطیہ فیضی کو لکھا ہے، لکھتے ہیں۔ "اگر طولانی مدّت کے لیے حیدرآباد میں قیام کروں تو مجھے یقین ہے کہ عالی جناب نظام مجھ سے ملاقات کریں گے۔ حیدرآباد میں مصروف اور سر شناس شخصیتوں سے ملاقات رہی۔ اکثر افراد نے مجھے اپنے گھروں پر دعوت دی۔ جناب سر اکبر حیدری اور ان کا خاندان نہایت شریف مہمان نواز اور علم دوست ہے"۔

حیدرآباد کے قیام کے دوران علامہ اقبال کی خواہش کے مطابق سر اکبر حیدری نے نظم طباطبائی سے موصوف کی ملاقات بھی کروائی جو اُس زمانے میں نظام کالج حیدرآباد میں فارسی زبان کے پروفیسر تھے۔ علامہ کے اصرار پر نظم طباطبائی نے کچھ اشعار سُنائے جنھیں اقبال نے سراہا اور تعریف کی۔ اس کے علاوہ علامہ نے جلیل حسن مانک پوری سے جو داغ دہلوی کے بعد میر محبوب علی پاشا کے

اُستاد بھی ہوئے ملاقات کی۔ جناب ظہیر دہلوی اور مہاراجہ کشن پرشاد سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے اس حیدرآباد کے قیام کے دوران ایک (۵۸) اشعار پر مشتمل نظم ''گورستان شاہی'' لکھی جسے حیدرآباد سے واپسی پر مجلہ مخزن شمارہ ۵/جون ۱۹۱۰ء میں چند مقدماتی جملوں کے ساتھ شائع کروایا جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

''حیدرآباد کے مختصر قیام کے دوران جناب نذر علی صاحب کے ہمراہ قطب شاہی مقبروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مقبرے جن کی عظمت باشکوہ اور جن کی تاریخ درس آموز ہے جہاں سلاطین قطب شاہی آرام کر رہے ہیں۔ یہاں خاموشی ہے، سکوتِ شب میں آسمان پر ابر کے ٹکڑوں کا ہجوم اور چاند کا منظر دردناک اور احساساتی بھی ہے۔ اس منظر نے مجھ پر ایسا اثر طاری کیا ہے جسے میں ہرگز بھول نہیں سکتا یہ اشعار میرے حیدرآباد کے سفر کی یادگار کے ساتھ ساتھ جناب سر اکبر حیدری اور اُن کی بیگم کی مہمان نوازی اور محبت کی یاد بھی تصور کیے جاسکتے ہیں۔ اقبال ۲۳/مارچ ۱۹۱۰ء کو حیدرآباد سے لاہور واپس ہوئے۔ سفر کے دوران دو روز اورنگ آباد میں قیام کیا اور عالمگیر اورنگ زیب کی قبر کی بھی زیارت کی''۔

اُس زمانے میں دہلی، لکھنو کی طرح حیدرآباد دکن بھی علمی ادبی اور ثقافتی راہوں پر گامزن تھا چنانچہ نظام دکن کی علم پروری اور ادب نوازی سے علامہ اقبال باخبر تھے۔ اس کے علاوہ مہاراجہ کشن پرشاد، سر اکبر حیدری۔ استاد جلیل مانک پوری۔ ظہیر دہلوی اور عبدالقادر گرامی جیسی شخصیتوں کی صحبت کو پسند کرتے تھے۔ اس کشش کی ایک وجہ سرزمین دکن میں علامہ اقبال کی قدردانی اور اُردوئے معلی (دہلی لکھنو، آگرہ) کے دبستانوں اور محلات میں علامہ کی زباندانی پر مسلسل اعتراضات بھی شامل تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۱۷ء میں جسٹس سید ہاشم بلگرامی کے انتقال کی وجہ سے حیدرآباد دیوانعالی میں جج کی نشست خالی ہوئی تو علامہ اقبال نے اس نشست کو حاصل کرنے کے لیے مہاراجہ کشن پرشاد کے خط میں خواہش کا اظہار کیا لیکن قسمت نے یاری نہ کی اور سیاست بازی نے ہمکاری نہ کی اور علامہ کی خدمات سے محکمہ دیوان عالی محروم رہا۔ علامہ کے اس خط میں جو مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ہے ہمیں

اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ علامہ کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ وہ ایک کتاب اسلام کی فقہ کے بارے میں انگریزی میں لکھیں لیکن عدم فرصتی نے اس کی اجازت نہ دی۔ سر اکبر حیدری نے چند مہینوں بعد علامہ کو قانون کے پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کی پیشکش کی لیکن اس پیش کش کو علامہ نے قبول نہ کیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی دعوت پر لیکچر دینے کے لئے علامہ اقبالؔ بذریعہ ٹرین ۱۹۲۹ء کو حیدرآباد پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر علامہ اقبالؔ کو خبر دی گئی کہ وہ نظام حیدرآباد کے مہمان ہیں اس لئے شاہی مہمان خانہ میں قیام کریں۔ اسٹیشن پر طالب علموں کی کثیر تعداد کے علاوہ سر اکبر حیدری، ڈاکٹر عبدالحکیم خلیفہ، ڈاکٹر عبداللہ عمادی، ڈاکٹر مظفر الدین قریشی اور دیگر اساتذہ عثمانیہ یونیورسٹی استقبال کے لیے موجود تھے۔ گل پوشی کے بعد طالب علموں نے اقبالؔ کی نظم ''ترانہ ہندی'' پڑھی۔

اقبالؔ اس بار چار دن حیدرآباد میں رہے۔ پہلے دن عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانہ کا جائزہ لیا اور دفتر کتب خانہ میں اپنا نام ثبت کیا۔ دوسرے دن باغ عامہ میں منعقدہ ایک جلسہ عام میں تقریر کی جس کی صدارت مہاراجہ کشن پرشادؔ نے کی۔ اُسی رات ضیافت عشائیہ کے بعد مہاراجہ کی حویلی میں محفل مشاعرہ برگزار ہوئی۔ مشہور شعرائے فارسی اور اُردو نے اس مشاعرہ میں شرکت کی جن میں حیدر جنگ نظمؔ طباطبائی، ضیاء جنگ، عزیزؔ یار جنگ، مسعود علی محویؔ، نظامؔ تیموری، کاظم علی باغؔ اور جوشؔ ملیح آبادی قابل ذکر ہیں۔ اقبالؔ نے مہاراجہ کے اصرار پر چند فارسی اشعار پڑھے۔ دو شعر پیش کئے جاتے ہیں

زندگی انجمن آرا و نگهدار خود است　　ای که در قافلهٔ بی همه شو باهمه رو

آن نگینی که تو با آہرمان ساختہ ای　　ہم بہ جبرئیل امین ہم نتوان داد گرو

تیسرے دن ۱۸ جنوری ۱۹۲۹ء کو گیارہ بجے علامہ اقبالؔ نے نظام دکن سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران علامہ نے چند فارسی اشعار پڑھے اور ایک نسخہ ''رموز بیخودی'' کا حضور نظام کو پیش کیا۔ حضور نظام نے اقبالؔ سے گلہ کرتے ہوئے کہا کہ ''جب ہم دہلی آئے تھے تو لاہور قریب تھا تم کیوں ہماری ملاقات کو نہ آئے''؟ اقبالؔ نے جواب دیا اُس روز بیمار تھا چنانچہ اب اُس ایک روز کی تلافی کے

لیے ڈیڑھ ہزار میل کا سفر طے کر کے آپ کی خدمت میں آیا ہوں۔ حضور نظام اس جواب کو سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میں تمھیں وزیر قانون بنا دوں گا۔ اقبالؔ نے فوراً جواب دیا۔ سرکار میری خواہش یہ ہے کہ مجھے آزاد ہی رکھیے۔ پھر اقبالؔ نے حضور نظام سے آئندہ سال کے لیے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ کی صدارت کی درخواست کی۔ نظام نے اس دعوت کو قبول کیا لیکن بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے پنجاب نہ جا سکے۔ علامہ ۱۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو حیدرآباد سے جنوبی ہندوستان کا دورہ ختم کر کے لاہور کے مقصد کے لیے روانہ ہوئے۔ علامہ نے مدراس میسور بنگلور اور حیدرآباد دکن میں اجتہاد اور فلسفہ اسلامی پر تقاریر کیں۔ موصوف نے بعد میں حبیب ہال لاہور میں جو مقالہ پڑھا وہ مقالہ ''اسلام میں اجتھاد'' تھا جسے وہ حیدرآباد میں پڑھ چکے تھے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۳۰ء کو انجمن حمایت اسلام کے جلسہ کی صدارت کے لیے علامہ کو حیدرآباد جانا تھا لیکن علامہ اپنی مصروفیات اور بیماری کی وجہ سے حیدرآباد نہ جا سکے اور اسی لئے نواب صادق علی خان والیٔ بہاولپور نے جلسہ کی صدارت کی۔

علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی

یہ سب کو معلوم ہے کہ علامہ اقبال نے تین شادیاں کیں تھیں۔ علامہ کی پہلی شادی ۱۸۹۳ء میں کریم بی سے ہوئی اُس وقت آپ کی عمر ۱۶ سال تھی اور ابھی آپ نے میٹرک پاس نہیں کیا تھا۔ علامہ نے یہ شادی والدین کے اصرار پر کی تھی۔ کریم بی اقبال سے تین سال بڑی تھی وہ ڈاکٹر عطا محمد کی بیٹی تھیں جو مشہور سرجن تھے۔ حکومت برطانیہ نے انھیں ۱۸۸۸ء میں خان بہادر کا خطاب دے کر سرجن جنرل کے عہدہ پر فائز کیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ وزارت خارجہ برطانیہ میں بھی بحیثیت سفیر کام کر چکے تھے۔ علامہ اقبال اپنے خسر کا بڑا احترام کرتے تھے اور اُن کی زندگی کے آخری وقت تک اُن سے روابط قائم تھے۔ کریم بی کے بطن سے پہلی بیٹی معراج بیگم ۱۸۹۶ء میں اور دوسرا بیٹا آفتاب اقبال ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے معراج بیگم بہت حسین اور نیک لڑکی تھی لیکن عنفوان جوانی میں (۱۹) سال کی عمر میں ۱۹۱۵ء میں گجرات میں انتقال کر گئی۔ علامہ اقبال کی یہ پہلی شادی شروع ہی سے ناراضگی، جدائی اور مشکلات سے دوچار تھی۔ شادی کے پہلے دو سال دلہا دلہن سیالکوٹ میں رہے لیکن اس کے بعد علامہ عموماً تنہا ہی رہے۔ چنانچہ سیالکوٹ کے بعد لاہور کالج میں شریک ہوئے جہاں ہاسٹل میں چار سال تنہا رہے اور کریم بی اپنے باپ کے گھر یا علامہ کے والدین کے ساتھ سیالکوٹ ہی میں رہی۔ علامہ کی ملازمت کے دوران بھی کریم بی نے لاہور میں رہنا پسند نہیں کیا چنانچہ اسی دوران میاں بیوی میں اختلافات بڑھتے گئے اور پھر ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک علامہ یورپ میں بھی تنہا ہی رہے۔ جب اقبال یورپ سے لاہور واپس ہوئے تو اُس وقت بھی کریم بی بہت کم ہی آتی تھیں چنانچہ علامہ نے یہ سوچا کہ طلاق دے دیں لیکن کریم بی راضی نہ ہوئیں اس لئے اقبال نے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ایک خاص مبلغ ہر ماہ کریم بی کے لیے مقرر رکھا جو علامہ کی آخری عمر تک جاری رہا۔ کریم بی علامہ کے انتقال کے آٹھ سال بعد گجرات میں انتقال کر گئیں اور وہیں دفن ہیں۔ محققین اقبالیات نے علامہ کی اس پہلی شادی میں شکست کے چند اہم اسباب بتائے ہیں۔ علامہ ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور تمام افراد خانوادہ ایک معمولی سے گھر میں زندگی کرتے تھے جب کہ کریم بی ایک دولت مند گھرانے کی

بنی تھی اور اُن کا گھر گجرات میں کسی عالیشان کوٹھی سے کم نہ تھا۔ کریم بی اپنے والدین سے دور رہنا پسند نہیں کرتی تھیں اور علامہ ہمیشہ سیالکوٹ اور گجرات سے دور معاش اور تحصیلات کی تلاش میں مصروف رہتے تھے۔

عطیہ فیضی نے اس شادی کی شکست کی اصلی وجہ دونوں کی فکری صلاحیتوں میں شدید فرق اور طبیعتوں میں اختلاف بتلایا ہے۔ یہی فکری اور مزاجی اختلاف سے علامہ پریشان اور رنجیدہ تھے چنانچہ ۹/اپریل ۱۹۰۹ء کے خط میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں کہ ''اب صرف آرزو یہی ہے کہ میں اس شہر سے کہیں باہر نکل جاؤں۔ تم کو معلوم ہے کہ میں اپنے بھائی کے احسانات اور محبتوں میں گھرا ہوا ہوں یہ لوگ مجھے کریم بی کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رہے ہیں جو ممکن نہیں۔ میں پہلے ہی سے اس شادی سے خوش نہ تھا۔ میں حاضر ہوں کہ اخراجات کفالت برداشت کروں لیکن اُس کے ساتھ زندگی بسر نہ کروں''۔ اسی وجہ سے علامہ اقبالؔ اور اُن کے بڑے فرزند آفتاب اقبال کے تعلقات بھی روز بروز خراب ہوتے گیے کیونکہ آفتاب اس شادی کی شکست کی پوری ذمہ داری علامہ پر دے رہے تھے چنانچہ وقت کے گذرتے ہوئے یہ اختلافات شدید تر ہوتے گئے آفتاب اقبال نے ۱۹۷۹ء میں ۸۱ سال کی عمر کر کے داعی اجل کو لبیک کہا اور اُن کے جنازے کو لندن سے کراچی لایا گیا جہاں وہ دفن ہیں۔ پہلی شادی کے (۱۷) سال بعد ۱۹۱۵ء میں علامہ نے دوسری شادی کی۔ مرزا جلال الدین لکھتے ہیں کہ علامہ کے ایک وکیل دوست گلاب الدین نے ایک کشمیری خاندان کی لڑکی کی نسبت لگائی جو موچی دروازے لاہور میں رہتی تھی۔ اس لڑکی کا نام سردار بیگم تھا جو ویکٹوریا گرلز سکول میں پڑھتی تھی۔ جب شادی کی بات پکی ہوگئی تو اقبالؔ چند دوستوں کے ہمراہ بارات کی شکل میں دلہن کے گھر گیے جہاں نکاح تو پڑھا گیا لیکن اُس وقت دلہن اقبالؔ کے گھر نہ آسکی چونکہ اُس وقت علامہ کو چند خطوط اور تحریریں دیں گئیں جن میں سردار بیگم کے اخلاق اور رفتار پر شک اور انتقاد کیا گیا تھا۔ چنانچہ اقبالؔ بہت رنجیدہ ہوئے اور دوستوں سے کہا کہ ان اطلاعات کے بارے میں تحقیقات کی جائے۔ کہتے ہیں کہ اقبالؔ نے سردار بیگم کو طلاق بھی دینا چاہا لیکن سردار بیگم اپنے باپ ہی کے گھر رہیں اور طلاق لینے سے انکار کر دیا۔

اس دوسری شادی نے اقبال کی اذدواجی زندگی کو اور پر آشوب بنا دیا چنانچہ تقریباً تین سال سردار بیگم باپ ہی کے گھر رہیں۔ اقبال کے دوستوں کو اقبال کی شکست خوردہ اور پریشان حال اذدواجی زندگی پر ترس آیا چنانچہ دوستوں نے اقبال کو تیسری شادی کرنے پر راضی کیا۔ علامہ کے دوست سید بشیر حیدر نے دوشیزہ مختار بیگم جو لدھیانہ کے لکھ پتی خاندان کی بیٹی تھی علامہ سے شادی کی نسبت طے کی چنانچہ ۱۹۱۳ء میں مختار بیگم سے شادی ہوئی اور دلہن لدھیانہ سے شوہر کے گھر محلہ انارکلی لاہور میں آ گئی۔ اِسی دوران علامہ کے دوستوں نے اُن مشکوک تحریروں کی تحقیق کی جو سردار بیگم کے اخلاق اور رفتار کے خلاف تھیں تو معلوم ہوا کہ ایک مقامی وکیل نے یہ جعلی خطوط لکھے تا کہ سردار بیگم کی شادی اُس کے لڑکے سے ہو سکے۔ جب اقبال کو اس کی اطلاع ملی تو وہ بہت غمگین ہوئے۔ سردار بیگم نے ۳ سال صبر کرنے کے بعد اقبال کو خط میں لکھا کہ "میں تمھارے نکاح میں ہوں۔ مجھ پر جو بہتان اور تہمت باندھی گئی ہے اُس پر تم کو یقین نہ کرنا چاہیے تھا۔ مجھے دوسری شادی کی فکر نہیں ہے۔ میں تمام زندگی اسی طرح گذار دوں گی لیکن روز قیامت تمہارا دامن پکڑ کر انصاف طلب کروں گی"۔ اس خط کا اقبال پر سخت اثر ہوا جب اقبال نے اس خط کو مختار بیگم کو سُنایا تو وہ رونے لگیں چنانچہ اقبال نے مختار بیگم کے کہنے ہی پر دوبارہ نکاح پڑھوا کر سردار بیگم کو انارکلی کے گھر میں رکھا۔ اب اس گھر کی رونق میں عجیب اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ اُس زمانے میں ایک ہی مکان میں سردار بیگم، مختار بیگم اور اقبال کی بہن کریم بی اپنے بچوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھیں۔ اس کے علاوہ علامہ کا گھر دوستوں اور رشتہ داروں کی ملاقات کا مرکز بھی بن چکا تھا۔

۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۳ء تک یعنی دس سال کے عرصے میں اگرچہ سردار بیگم اور مختار بیگم اقبال کے ساتھ زندگی گذار رہی تھیں لیکن صاحب اولاد نہ ہو سکیں اور اتفاق ۱۹۲۴ء میں دونوں بیویاں ایک ہی زمانے میں حاملہ ہوئیں چنانچہ مختار بیگم اپنی ماں کے پاس لدھیانہ گئیں لیکن وہاں شدید بیمار ہو گئیں۔ علامہ مختار بیگم کے آخری وقت لدھیانہ پہنچے اور اُن کے مرنے سے کچھ منٹ قبل بات چیت کی۔ مختار بیگم کی موت کا اقبال پر بڑا اثر ہوا جو اُن کے بعض خطوط اور لوح قبر پر کندہ اشعار سے واضح ہے۔

سردار بیگم کے بطن سے ۱۹۲۴ء میں سیالکوٹ میں جاوید اقبال پیدا ہوئے اور اُسکے بعد آٹھ سال بعد ایک لڑکی منیرہ بیگم پیدا ہوئیں۔ سردار بیگم ۱۹۳۵ء میں انتقال کر گئیں اور لاہور میں دفن ہیں۔

علامہ اقبالؔ پر تہمت شراب نوشی

علامہ اقبالؔ نے بانگ درا میں زہد اور رندی کے عنوان پر جو نظم لکھی اُس میں اپنی شخصیت کا ایک مختصر لیکن جامع خاکہ پیش کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

ع۔ اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے

ع۔ مجموعۂ اضداد ہے اقبالؔ نہیں ہے

یہ اقبالؔ کا خود اقبالؔ پر بہت صحیح اور معقول ریویو ہے۔ جدید علم تحقیق کے اصولوں کے تحت ہر متنازعہ مسئلہ کو جذباتی اور عقیدتی اثر کے تحت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا یعنی اگر کسی معتبر شخصیت پر کسی رکیک فعل کا الزام لگایا گیا ہے تو اُسے وقتی طور پر فراموش کرنے یا اُس پر بحث نہ کرنے سے وہ ختم نہیں ہوتا بلکہ الزام شدید اور محکم تر ہوتا جاتا ہے اس لیے ان متنازعہ مسائل پر بھی گفتگو لازم ہے تاکہ الزام کی تردید مین مستند حوالاجات اور گذارشات دفتر تاریخ میں ثبت ہو جائیں اور حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔

علامہ اقبالؔ پر ابو محمدؐ دیدار علی خطیب مسجد وزیر خان نے کفر کا فتوی صادر کیا۔ بہت سے نام نہاد علماء اور مولویوں نے ملحد، زندیق، حوس راں، عیاش، غنائی کے علاوہ شرابی جیسے اتہامات کے انبار لگائے کیوں کہ یہ کم عقل ملا علامہ کی روشن فکری سے خوف زدہ تھے جس سے اُن کے ریاکارنہ افعال کی نقاب کشی ہو رہی تھی۔ علامہ پر مختلف الزامات عاید کر کے وہ عام فہم لوگوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ اقبالؔ مسلمان نہیں ہے اس لیے مصلح قوم یا مبلغ دین اسلام نہیں ہو سکتے۔ یعنی دوسرے معنی میں وہ علامہ کی سیاسی مذہبی اخلاقی اور علمی شخصیت کا قتل کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے ہر ذریعہ اور حربہ کو جائیز سمجھتے تھے۔ فارسی محاورے کی رو سے ؎ تا نباشد چیزکی مردم نگویند چیزھا

یعنی جب تک کوئی بات نہ ہو لوگ اُس کا بتنگڑ نہیں بناتے۔ ہمیں اس مضمون میں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا مسائل تھے جن کی وجہ سے یہ اتہامات علامہ پر عاید کیئے گیے۔ ہماری تمام تر گفتگو مستند حوالوں اور منطقی اصولوں پر ہوگی اور ہم یہ ثابت کریں گے کہ علامہ نے عمر بھر شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ کو آواز اور ساز سے بچپن سے خاص شغف اور لگاؤ تھا۔ اسی لیے علامہ نے کالج کی تحصیل

کے دوران ستار خریدا تھا اور کسی خاص استاد سے مہارت بھی حاصل کی تھی۔ علامہ اپنی عمر کے آخری حصے تک ستار سے محظوظ ہوتے رہے۔ علامہ اقبال کو نغموں اور مجروں سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ اُن دنوں اُردو اور فارسی اساتذہ کی غزلیات آلات موسیقی کے ساتھ گائی جاتی تھیں اور یہ محفلیں خوبصورت جوان عورتوں سے سجی رہتی تھیں۔ تاریخی حوالوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اقبال بعض اوقات ان محفلوں میں شرکت کرتے تھے اور چونکہ وہاں رقص اور مے گساری کے بساط بھی سجے ہوتے تھے اس لیے بعض افراد کے لیے یہ تصور کرنا ناممکن تھا کہ علامہ وہاں صرف نغمات سننے کے لئے جاتے تھے اور مے گساری اور دوسری لغویات سے اُن کو کوئی سروکار نہ تھا۔ جب کبھی علامہ اپنے دوست خواجہ حسن نظامی کے پاس مہمان ہوتے تو خواجہ صاحب اقبال کے لیے قوالی کی محفل ضرور سجاتے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اقبال صمیم قلب سے قوالی کے دلدادہ ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ اقبال تھیٹر شو میں بھی شرکت کرتے چنانچہ آغا حشر کشمیری کا شو جب لاہور میں لگایا گیا تو اقبال اُس کو دیکھنے کے لیے دوستوں کے ساتھ گئے۔ محمد عثمان اپنی تالیف میں لکھتے ہیں کہ اقبال یورپ سے واپس ہونے کے بعد یعنی ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۱ء تک بڑے اضطراب اور روحی و جسمی کشمکش میں مبتلا تھے اور اُن کا دل ایک تشنۂ محبت تھا جس کی وجہ اُن کا عشق ناکام تھا۔ مسعود الحسن اقبال کے بارے میں کہتے ہیں کہ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان عطیہ فیضی اور اقبال نے شادی کرنے کی تصمیم کی لیکن عطیہ فیضی کے ہندوستان آنے کے بعد اُس کی تیز طبیعت نے اقبال کو شادی سے منحرف کر دیا چنانچہ ۱۹۱۲ء میں عطیہ نے رحمان سے شادی کر لی اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے ۱۹۱۵ء کے بعد رومانٹک اشعار جیسے'' کی گود میں بلی دیکھ کر''، ''پھول کا تحفہ وصول ہونے پر''، ''وصال'' ''حسن عاشق'' اور ''نوائے غم'' نہیں لکھے۔ اگرچہ عطیہ فیضی نے اپنی کتاب اقبال میں لکھا ہے کہ اقبال کبھی بھی رومانٹک شاعر نہیں رہے۔

عبدالمجید سالک اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ علامہ شوخ، ہنس مکھ، حساس، اور خوش گذاراں تھے۔ جوانی کے زمانے میں گاہی اوقات رقص اور آواز کی محفلوں میں شرکت کرتے لیکن مے گساری سے نفرت رکھتے تھے اور اُس زمانے میں اُن کی مالی حالت کمزور تھی اور ان پُر خرچ چیزوں کو تحمل نہیں

کر سکتے تھے۔ چونکہ اقبالؔ بہت شوخ اور بذلہ سنج تھے اور بعض اوقات طنزیہ شراب خوری کا ذکر اور مذاق اُڑاتے تھے اس لیے کم فہم اور عام لوگ جن میں جاہل مولوی سرفہرست تھے مذاق کو حقیقت تلقین کرتے تھے۔ ہم اس مضمون میں دو تین مستند واقعات نقل کریں گے جو ہمارے مطالب کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔

کتاب آئینہ اقبالؔ میں عبدالہ قریشی لکھتے ہیں کہ ایک دن اقبالؔ کے دوست دین محمد فوق اقبالؔ سے ملنے کے لئے آئے۔ اقبالؔ اُس وقت اپنے کتب خانے کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ کتابوں کو الٹ پلٹ رہے تھے۔ فوق نے اقبالؔ سے پوچھا۔ کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ اقبالؔ نے فوراً جواب دیا ایک بوتل انگور کی شراب کی کتابوں کے پیچھے چھپایا تھا اُسے ڈھونڈ رہا ہوں کیوں کہ کل شمس العلما مفتی عبداللہ ٹونکی میرے پاس آئے تھے، کہیں مفتی صاحب اُسے اٹھا کر نہ چلے گئے ہوں۔ روایات اقبالؔ میں عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ ایک بار میاں شاہ دین نے اپنے گھر ایک محفل ضیافت سجائی اور انگریز مہمانوں کے خورد و نوش کے لیے علیحدہ کمرے میں انتظام کیا تھا۔ خود میاں شاہ دین دروازے پر مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ جب میاں صاحب نے اقبالؔ کو مرزا جلال الدین کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو مسکرا کر کہا کہ میں نے آپ دونوں کے لیے علیحدہ کمرے میں انتظام کیا ہے۔ اقبالؔ نے ہنس کر کہا ہم نے آپ سے صرف دو حرف سیکھے ہیں۔ ایک یہ کہ چھپا کر پیو اور دوسرے اپنے گناہ میں کسی کو شریک نہ کرو۔ اس طرح کے کئی شوخیانہ اور طنزیہ جملوں کی سُن کر دشمن اور کینہ صفت افراد نے اقبالؔ کو بے گسار ثابت کرنے کی کوشش کی جس کا اثر کچھ اقبالؔ کے نادان حامیوں پر بھی پڑا چنانچہ عبدالمجید سالکؔ نے ذکر اقبالؔ میں صفحہ (۱۷) میں لکھا ہے کہ اقبالؔ جوانی کے زمانے میں شراب پیتے تھے لیکن بعد میں اس کام سے توبہ کر لی اور پھر کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ عبدالمجید سالکؔ نے اپنے اس ادعا کے ذیل میں ۱۹۱۸ء کے ایک مشاعرے کا ذکر کیا جو لٹن لاج میں برگزار ہوا تھا۔ اقبالؔ اس مشاعرے میں سب سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ اقبالؔ نے سالکؔ کو دیکھ کر کہا کہ ھتہ لاؤ۔ سالکؔ نے جواب دیا ڈاکٹر صاحب ھتہ آپ کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ اقبالؔ نے مسکرا کر کہا کہ "دوست عزیز شراب تو چھوڑ چکا ہوں اور اب

چاہتے ہو کہ حقہ بھی چھوڑ دوں"۔ سالک لکھتے ہیں کہ اس جملہ کا کوئی شاہد اور گواہ نہیں ہے کیونکہ اقبال نے جب یہ جملہ کہا اُس وقت صرف میں ہی موجود تھا۔ بہر حال جس جملہ کا کوئی گواہ اور شاہد نہ ہو اور دوسری طرف ایک شوخیانہ طبیعت جو ہزار اشاروں میں بات کرنے کا فن جانتی ہے تو اہل فکر کے نزدیک یہ مسئلہ خود بہ خود مشکوک اور بے اساس ہو جاتا ہے۔ غلام مصطفیٰ تبسم اور عبدالمجید سالک نے فارسی کے چند اشعار جو "رموز بے خودی" میں شراب اور عشق کے معنی میں آئے ہیں انھیں اقبال کی شراب نوشی کے اعتراف کے طور پر پیش کیا ہے۔ اگر شراب تخیل، شراب طہورہ، جام تصوف، بادہ عرفان، مستی بے خودی، اور قلندری کو شراب خوری کی سند تصور کیا جائے تو کوئی بڑا اور چھوٹا صوفی شاعر اس اتہام شراب خوری سے بچ نہیں سکتا اگر چہ وہ عطار، سعدی، مولوی، حافظ، خسرو، اور میر تقی میر کیوں نہ ہو۔ جو اشعار اقبال کی مے گساری کے ذیل میں پیش کیے گئے ہیں اُن میں یہ اشعار قابل ذکر ہیں۔

مدتی بہ لالہ رویان ساختم عشق با مرغولہ مویان باختم
بادھا با ماہ سیمایان زدم بر چراغ عافیت دامان زدم
این شراب از شیشۂ جام نریخت ایں ذر را ز دامنم نریخت

یعنی میں بڑی مدت تک گل رخوں کے ساتھ رہا اور اُن سے میں نے عشق میں شکست کھائی۔ میں نے چاند صورتوں کے ساتھ شراب پی اور اپنی عافیت کے چراغ بجھانے کی کوشش کی۔ اس شراب کو مری جان کے شیشے سے خالی مت کر اور طلا کو میرے دامن سے مت پھینک۔

اگر ان اشعار کو شراب نوشی کی سند کہا جائے تو فارسی اور اُردو شعرا جن کی پارسائی مشہور ہے ان کے دفتر اس طرح کے اشعار سے بھرے پڑے ہیں اور اس طرح سے کوئی شاعر مے گساری کی تہمت سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ صرف یہی نہیں کہ اقبال شراب خور نہ تھے بلکہ اقبال کو شراب خواری سے نفرت تھی جس کا پتہ ہم کو اُس حکایت سے ملتا ہے کہ جس میں علامہ نے جاوید اقبال کی وجہ سے اپنے خادم علی بخش کو معاف کر دیا تھا۔ علامہ کی وفات سے کچھ مہینے قبل ایک سکھ علامہ سے ملنے کے لیے آیا اُس وقت علامہ ایک عرب قاری کی تلاوت سماعت فرما رہے تھے۔ علی بخش نے سکھ کو علامہ تک پہنچایا اور وہ علامہ

سے کچھ دیر بات چیت میں مصروف رہا پھر کمرے سے باہر نکل کر علی بخش سے کہا کہ تانگے میں جو بوتل اور گلاس ہے اُسے لے آؤ۔ علی بخش نے سکھ کے احترام میں یہ کام انجام دیا۔ سکھ نے صحن میں کرسی پر بیٹھ کر شراب خوری شروع کر دی۔ پندرہ بیس منٹ بعد علامہ نے علی بخش سے پوچھا کہ سردار صاحب کہاں ہیں۔ علی بخش نے جواب دیا کہ صحن میں بیٹھ کر شراب پی رہے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ علامہ کا چہرا غصہ سے لال ہو گیا فوراً اُسی حالت میں کمرے سے نکلے اگرچہ سخت بیمار اور کمزور ہو چکے تھے لیکن بوتل کو زمین پر مار کر توڑ دیا اور سکھ کے گریباں پکڑ کر گھر سے باہر کر دیا۔ جاوید اقبال راقم ہیں کہ علامہ کی غصہ کی آواز سن کر میں صحن میں آیا اور میں نے دیکھا کہ علامہ علی بخش پر غصہ کر رہے ہیں کہ کیوں گھر میں شراب پینے کی اجازت دی۔ بہر حال کچھ دنوں خفا رہنے کے بعد جاوید اقبال کی سفارش پر علامہ نے علی بخش کو معاف کر دیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص خود شرابی ہو یا پہلے شراب پی چکا ہو تو کیا وہ اس قسم کا عمل کر سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب ہر ذی شعور انسان دے سکتا ہے۔

علامہ اقبال ہمیشہ تقوی اور پارسائی کے بجائے رندی اور خوش گذارنی کی شہرت کو پسند کرتے تھے لیکن اُن کے قریبی دوست اُن کے ہر عمل اور فعل سے واقف تھے چنانچہ کسی بھی قریبی دوست نے اُن کی شراب خوری کا ذکر یا اُس کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو مہاراجہ کشن پرشاد جو نظام حیدر آباد کے وزیر آعظم تھے اور ہندو تھے اپنے شخصی خط میں لکھتے ہیں" ہر روز صبح تین بجے اور بعض اوقات چار بجے اٹھ جاتا ہوں اور پھر نہیں سوتا، اگرچہ بعض اوقات جانماز پر ہی بیٹھے بیٹھے سو جاتا ہوں"۔ چونکہ علامہ نام نہاد کم علم جاہل ملاؤں سے الرجک تھے اور انھیں اسلام کے دامن پر داغ اور اسلامی شریعت کے لیے نقصان رساں سمجھتے تھے اس لیے ان کو آگ بگولہ کرنے کے لیے ہمیشہ شوخیاں کرتے جن کی تفصیل زیادہ ہے ہم یہاں صرف چند واقعات پیش کریں گے۔ عبدالمجید جواہر اقبال میں لکھتے ہیں کہ ایک مولوی صاحب جو پروفیسر آرنلڈ سے علیگڑھ کالج سے متعارف تھے سیر و سیاحت کے لیے لندن پہنچے۔ پروفیسر آرنلڈ نے اقبال سے خواہش کی کہ مولوی صاحب کو لندن کی مکمل سیر کروائیں۔ علامہ نے مولوی صاحب کو تمام روز لندن کی سیر کروائی اور پھر شام کو ایک ریسٹورنٹ لے

گئے جہاں چند ناچنے والی لڑکیوں نے مولوی صاحب کو گھیر لیا۔ کسی نے ناز و عشوہ سے قہوہ پلایا، کسی نے ڈاڑھی پر دست نوازش پھیرا اور کسی نے مولوی کے چہرے پر لپ اسٹک کا نشان چھوڑ دیا جس پر مولوی صاحب بہت بگڑے اور آرنلڈ سے اقبال کی شکایت کی۔ جب آرنلڈ نے اقبال سے اس کی وجہ پوچھی تو اقبال نے کہا کہ میں نے آپ ہی کے کہنے کے مطابق مولوی صاحب کو لندن کی زندگی کے دونوں رخ دکھائے تاکہ مولوی صاحب کو سکّے کے دونوں رخوں کا علم ہو سکے۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ابولیث صدیقی نے ملفوظات اقبال میں لکھا ہے کہ جب اقبال مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کنفرانس میں شرکت کی غرض سے لکھنو گئے تھے وہاں جب شام کو اقبال کسی محفل نغمہ و رقص میں پہنچے تو وہاں ایک مولوی صاحب بھی پہلے سے موجود تھے جو فوراً اقبال کو دیکھ کر فرار ہو گیے لیکن اپنا شناختی کارڈ بھول گئے۔ جس کو علامہ نے ایک نامہ کے ذریعے صدر کانفرنس کے توسط سے مولوی صاحب تک پہنچایا جس میں لکھا تھا کہ "چونکہ میرے پاس مولوی صاحب کا ایڈرس نہیں ہے اس لیے یہ شناختی کارڈ آپ کے توسط سے پہنچا رہا ہوں جسے مولوی صاحب نے محفل نغمہ و رقص میں چھوڑ دیا تھا"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ جوانی میں بڑے زندہ دل جوان تھے۔ خطوط اقبال میں شیخ عطاءاللہ لکھتے ہیں کہ سیالکوٹ میں ایک طوائف امیر بیگم بہت خوبصورت اور اچھے گانے والوں میں شمار کی جاتی تھی۔ یہ اردو اور فارسی کے اساتذہ کی غزلیات بڑے خاص انداز سے سُناتی تھی اور علامہ بعض اوقات اس کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے چنانچہ استاد میر حسن کے بیٹے سید تقی شاہ جو اقبال کے بچپن کے دوست تھے اُن کو ۱۹۰۳ء کو خط میں لکھتے ہیں "امیر بیگم کہاں ہے۔ آپ براہ کرم اُس کے پاس جا کر میری طرف سے اُس کی احوال پرسی کریں اور کہیں کہ اقبال بہت مضطرب ہے جتنا اُس سے فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے احساس کر رہا ہوں کہ اُس سے نزدیک ہوتا جا رہا ہوں"۔

اس کے علاوہ علامہ اور عطیہ فیضی کے تعلقات اگرچہ پاک اور دوستانہ تھے لیکن بہر حال دونوں میں محبت اور ایک دوسرے کے دل میں جگہ ضرور تھی۔ بعض کتابوں میں علامہ اقبال کی ایک دولت مند اینالوی لڑکی "رامی" سے دوستی کا ذکر بھی ملتا ہے جو اقبال سے انگلستان میں ملی اور اُس کی وجہ سے علامہ

نے اٹلی کی سیر کی اور موسولینی سے ملاقات کی۔ علامہ اقبال کے کئی خطوط جو عشقیہ ہیں مس ویگے ناسٹ کے نام بھی ہیں۔

محمد دین تاثیر اپنے مقالہ رجال اقبال ۱۹۵۱ء میں لکھتے ہیں کہ "علامہ اقبال اپنی نفسانی خواہشوں پر مکمل تسلط رکھتے تھے۔ میں مطمین ہوں کہ وہ کوئی چیز ہم سے پنہاں نہیں رکھتے تھے۔ ہر چیز کا وہ مجھکو واضح جواب دیا کرتے تھے کیوں کہ ہم جس چیز کو رندی تصور کرتے تھے وہ شراب خوری نہ تھی بلکہ رندی حرف اور فکر کی تھی اور یہ چیز پنہاں کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اقبال کو ولی نہیں کہتا لیکن وہ عاشق رسولؐ اور خادم اولیا ضرور تھا۔ وہ نماز دار اور نماز شب گذار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے اخلاق اُن مسلمانوں میں جو انگریزی تہذیب کے پروردہ اور دلدادہ ہیں بہت کم دیکھے جاتے ہیں۔ خالد نظر صوفی کی تالیف "اقبال گھر میں" شیخ احمد کے توسط سے لکھتے ہیں کہ میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۸ء تک کئی بار اقبال کے گھر گیا اور کئی بار اُس میں قیام بھی کیا لیکن میں نے کبھی اقبال کو شراب نوشی یا شراب کے نشے میں نہیں دیکھا اور نہ کبھی شراب خوری کے بساط ان کے گھر میں دیکھے۔ اگر وہ شراب کے معتاد تھے تو وہ شراب خوری اور وسائل شراب خوری کو پنہاں نہیں کر سکتے تھے۔ میں اپنے مشاہدات کی بنا پر اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اقبال کی شراب نوشی کی داستانیں جھوٹی ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں اقبال اپنے بھائی کے مقدمہ کے سلسلے میں شہر اٹک جہاں پر اُن کے کسی وکیل دوست نے ضیافت کی پارٹی رکھی اور اس میں انگریزی مہمانوں کے لیے شراب خوری کا انتظام کیا۔ شیخ اعجاز احمد کی عمر اُس وقت ۱۳ سال تھی اور وہ علامہ کے ہمراہ تھے۔ اعجاز احمد کہتے ہیں جب میزبان نے علامہ اقبال کو جام شراب پیش کیا اور اصرار بھی کیا تو علامہ نے فرمایا "یہ چیز جو یورپ میں پانی کی طرح مہیا تھی اور اُس کو میں نے ہاتھ نہیں لگایا اب کیسے منہ لگا سکتا ہوں"۔ علامہ کے فرزند جاوید اقبال جو ہمیشہ اقبال کے ساتھ رہے لکھتے ہیں کہ میں نے علامہ کو حقہ پیتے ہوئے تو دیکھا لیکن کبھی شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی شراب کے بساط اور لوازم کو گھر میں دیکھا۔ اقبال کا گھر جو محلہ انارکلی میں تھا اس میں علامہ کی دو بھتیجیاں بھی زندگی بسر کرتی تھیں چنانچہ ایک بھتیجی جس کا نام حلیمہ تھا کہتی ہیں کہ "علامہ نے کبھی شراب نہیں پی اور کبھی شراب

پینے کی طرف تمایل بھی ظاہر نہیں کیا"۔ عطیہ فیضی کے توسط سے جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ میرے عطیہ فیضی سے اُن کی آخری عمر تک تعلقات باقی رہے۔ میں اُن سے ملنے کے لیے کراچی بھی جایا کرتا تھا چنانچہ عطیہ فیضی نے بتلایا کہ انھوں نے کبھی بھی اقبال کو شراب پیتے ہوئے یا نشہ کی حالت میں نہیں دیکھا۔ علامہ اقبال کے قدیم اور صمیمی دوست جن سے اُن کی بے تکلفی اور شوخی رہتی تھی، جن میں استاد میر حسن کے فرزند سید تقی شاہ ، مدیر مخزن سید عبدالقادر، محمد دین فوق، نواب سر ذوالفقار علی خان، مرزا جلال الدین، سردار امراؤ سنگھ اور ان کے خادم علی بخش قابل ذکر ہیں، بعض احباب نے اقبال کی شخصی زندگی پر تفصیلی ریویو بھی لکھے ہیں لیکن کہیں بھی کسی نے اقبال کی مے گساری کا ذکر نہیں کیا، بلکہ ان اتہامات کی سختی سے تردید بھی کی ہے۔

پنڈت شیونارائین اپنی کتاب سفرنامہ شیم میں لکھتے ہیں کہ ریلوے اسٹیشن پر ایک شاعر جس کا نام جلال تھا ملاقات ہوئی وہ امیر مینائی کا شاگرد تھا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ میں بھی شاعر ہوں اور لاہور میں زندگی بسر کرتا ہوں تو اُس نے علامہ اقبال کے بارے میں سوالات کیے اور کہا کہ میری علامہ سے ملاقات آگرہ میں ہوئی تھی۔ سُنا ہوں کہ وہ آج کل کبوتر بازی اور خوش گذارنی میں مصروف ہیں اور شاعری و وکالت چھوڑ دی ہے۔ میں نے فوراً جواب دیا یہ سب علامہ پر اتہامات ہیں۔ علامہ روز عدالت تشریف لاتے ہیں اور آج کل اُردو سے زیادہ فارسی اشعار لکھ رہے ہیں۔ میں بعض اوقات اپنے اشعار پر اُن سے اصلاح لیتا ہوں۔ پنڈت نے مزید کہا کہ "اقبال ہندوؤں کی دولت تھے لیکن اب آپ لوگوں کے مال غنیمت ہیں جس کی آپ لوگوں کو قدر نہیں"۔

ہم اپنے مضمون کو خواجہ حسن نظامی کے اُس جملہ پر ختم کرتے ہیں جو انھوں نے "مالہ یتیم" سُن کر اپنے سر سے عمامہ اُتار کر اقبال کے سر پر رکھا۔ اور فرمایا۔

"میرا تقویٰ اور میری ساری پارسائی تیرے ایک لمحہ کی فکر و تخیل پر نثار"

علامہ اقبالؔ اور آفتاب اقبال

باپ اور بیٹے کے کشیدہ تعلقات کی داستان

آفتاب اقبال، علامہ اقبالؔ کے بڑے بیٹے تھے جو ۱۸۹۹ء میں پنڈ دادن خان ضلع شاہ پور میں پیدا ہوئے۔ ان کی ماں علامہ کی پہلی بیوی کریم بی تھیں جن سے علامہ کی شادی ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ کریم بی کے والد ڈاکٹر شیخ عطا محمد سیول سرجن کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ کریم بی علامہ کے انتقال کے آٹھ سال بعد ۱۹۴۶ء میں گجرات میں فوت ہوئیں اور وہیں مدفون ہیں۔ کریم بی کے بطن سے علامہ کو ایک لڑکی معراج بیگم بھی ہوئی جو (۱۹) سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ اگرچہ بچپن ہی سے آفتاب اور ان کی بہن معراج اپنی ماں کے ساتھ نانا کے گھر گجرات میں رہتے تھے لیکن آفتاب، اقبالؔ کے والد نور محمدؒ کے نور نظر تھے اور نور محمد ہی نے ان کا نام آفتاب اقبال رکھا تھا۔ علامہ اقبالؔ نے آفتاب اقبال کو سکاچ مشن ہائی سکول میں شریک کروایا جہاں انھوں نے ۱۹۱۶ء میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا پھر سینٹ اسٹیفن کالج دہلی سے بی۔اے (B.A) کا امتحان بھی فلسفہ میں آنرز کے ساتھ پاس کیا اور ۱۹۲۱ء میں ایم۔اے (M.A) کی ڈگری فلسفہ میں حاصل کی۔ آفتاب کے ماموں کیپٹن غلام محمد اور نانا ڈاکٹر عطا محمد نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان روانہ کیا جہاں آفتاب نے ۱۹۲۲ء میں لندن یونیورسٹی سے فلسفہ میں بی۔اے (B.A) درجہ اول میں کامیاب کیا اور پھر ۱۹۲۴ء میں اسی یونیورسٹی سے ایم۔اے (M.A) کر کے دو سال کے لئے ہندوستان آئے اور پھر انگلستان جا کر تین سال تک وہاں School of Oriental Studies میں ملازم ہوئے۔ اسی دوران Lincoln Inn میں داخلہ لے کر بار ایٹ لا (Bar At Law) میں کامیابی حاصل کی لیکن مالی مشکلات کی بنا پر وکالت نہ کر سکے۔ سر اکبر حیدری نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں ملازمت دینے کی کوشش کی لیکن کوئی مناسب جگہ ان کے لئے یونیورسٹی میں نکل نہ سکی۔ آفتاب نے کچھ عرصے کے لئے اسلامیہ کالج لاہور میں بحیثیت صدر شعبہ انگریزی ملازمت کی لیکن ۱۹۴۲ء میں بہ حیثیت بیرسٹر پریکٹس شروع کی اور

پاکستان کے قیام کے بعد وہ مستقل طور پر کراچی منتقل ہو گئے اور بیرسٹری پریکٹس میں آخری عمر تک مصروف رہے اور یہیں پر رشیدہ بیگم سے شادی کی۔ آفتاب اقبال کا (۸۱) سال کی عمر میں ۱۴/اگست ۱۹۷۹ء کو لندن میں انتقال ہوا اور ان کے جنازے کو کراچی لا کر قبرستان بخی حسن میں دفن کیا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی ہر گونہ مسائل سے دوچار تھی۔ علامہ اپنی پہلی شادی سے خوش نہیں تھے اور کریم بی کو طلاق دینا چاہتے تھے۔ لیکن کریم بی نے طلاق کے بدلے جدا زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی اور علامہ اپنی آخری عمر تک اُن کے اخراجات برداشت کرتے رہے۔ اس شادی کے بارے میں ۹/اپریل ۱۹۰۹ء کو عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں "میری تمنا آرزو یہ ہے کہ اس شہر سے کہیں باہر نکل جاؤں لیکن تم جانتی ہو کہ میں اپنے بھائی کا احسان مند ہوں جو میرے اس شہر سے باہر جانے کے مخالف ہیں۔ میری زندگی سخت مصیبت زدہ ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں کسی طرح سے کریم بی کے ساتھ زندگی بسر کروں جو ممکن نہیں، میں پہلے ہی سے اس شادی سے خوش نہ تھا۔ میں حاضر ہوں کہ اخراجات کفالت برداشت کروں لیکن اُس کے ساتھ زندگی بسر نہ کروں"۔

عطیہ فیضی نے اس شادی کی شکست کی وجہ دونوں کی فکری صلاحیتوں میں شدید فرق اور طبیعتوں میں اختلاف بتایا ہے۔ اس شادی کے اختلافات اور دوری کی وجہ سے آفتاب اقبال، علامہ کی محبت اور شفقت سے محروم ہوئے اور چونکہ وہ اپنی ماں کے ہم خیال تھے اور اس شادی کی شکست کے پورے ذمہ دار علامہ کو سمجھتے تھے اس لئے روز بروز اُن کے اور علامہ کے درمیان تعلقات خراب ہوتے گئے۔ نذیر نیازی "دانائی راز" میں اس شادی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اس شادی کی شکست کی وجہ کریم بی کے اخلاق اور ان کی خشک طبیعت تھی اس کے علاوہ خود آفتاب کی رفتار و گفتار انھیں علامہ سے دور کھینچتی جاتی تھی"۔ جاوید اقبال نے اپنی کتاب "زندہ رود" میں لکھا کہ "میں ان مطالب کو بیان کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ علامہ نے جو رویش اختیار کی تھی اگرچہ وہ عمدی نہ تھی لیکن رویش معقول نہ تھی۔ آفتاب ضدی تھے اور ہمیشہ علامہ کے خلاف کھڑے ہوتے اور علامہ کے خلاف جو اتہامات لگائے جاتے وہ اُن سے فائدہ اُٹھاتے تھے"۔

ہوں اور میرے لبوں پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا۔ شاید آپ پہلے آدمی ہیں جسے میں نے یہ باتیں لکھی ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ نے اس کی مدد کی ہے کچھ اس لئے کہ اس نے آپ کو خوب متاثر کیا ہے اور کچھ میرے تعلق سے آپ کی فیاض فطرت اس کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی مگر مجھے یقین ہے آپ کا اس پر اور مجھ پر بڑا کرم ہوتا اگر اس کو کوئی موضوع ملازمت جامعہ عثمانیہ میں دلا سکتے'' اس خط کا جواب ۱۱ر مئی ۱۹۳۱ء کو سر اکبر حیدری نے دیا اور علامہ کی مجبوری کو تسلیم کیا اور انھیں یقین دلایا کہ وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کو کوئی موزوں جگہ دلوانے کی اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔ علامہ نے ۱۴ر مئی کو اس خط کے جواب میں لکھا۔ ''یہ نوجوان اب تک (۷۰) ہزار روپے اپنے اوپر خرچ کر چکا ہے۔ اس میں سے خود اپنے بقول اس نے (۵۰) ہزار روپے انگلستان میں قرض لئے ہیں۔ میں نے اس کی ماں کو دس ہزار روپے دئے تھے جو اس نے سب کے سب اس پر خرچ کر دئے اور یہ رقم بھی اس کے علاوہ ہے جو اس نے اور اس کے باپ نے اس لڑکے کو دیے۔ اس کی انگلستان سے واپسی کے صرف ایک دو ماہ قبل مجھے ایک ہزار روپے دینے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے باوجود وہ اکثر و بیشتر بلیک میلنگ پر مبنی خطوط بھیجتا رہتا ہے۔ میں اس کے تازہ ترین خط کی نقل آپ کو ارسال کرنا چاہتا تھا مگر میں ایسا نہیں کرتا بالخصوص اس واسطے کے میں نے سوچا اس کے بعد آپ اس کے ساتھ ہمدردی کرنا ترک فرمادیں گے فارسی کا یہ شعر میری موجودہ کیفیت ذہنی کے مطابق ہے۔

آں جگر گوشہ ہماں شد کہ من اول گفتم کہ چو شوید لبش از شیر جگر خوارہ شود

(یعنی یہ جگر کا ٹکڑا وہی ہوا جو میں نے شروع میں کہا تھا کہ جب دودھ منہ سے پونچھے گا تو جگر خوار بن جائے گا)

اگر چہ کچھ اطلاعات کے مطابق اکبر حیدری اور علامہ کے درمیان اس مسئلہ پر گفتگو جاری رہی چناں چہ اکبر حیدری ۱۲ر فبروری ۱۹۳۷ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''اگر مجھے پہلے ہی سے ان ناخوشگوار حالات کا علم ہوتا جس کی آپ نے نشاندہی کی ہے تو بلاشبہ میں اس اپیل کو نظر انداز کر دیتا''۔

آفتاب اقبال علامہ کے انتقال کے (۴۰) سال بعد تک زندہ رہے لیکن وہ اب ہمیشہ اقبال کے

مداح خوان تھے اور ہمیشہ اپنے والد کے محاسن پر گفتگو کرتے تھے۔ جن افراد نے کراچی کے یوم اقبال کے جلسات میں شرکت کی ہے وہ جانتے ہیں کہ آفتاب اقبال ہر سال ان جلسات میں دلنشین اور فلسفانہ تقریر کرتے اور علامہ کے کلام پر تبصرے کرتے تھے۔

اقبالؔ کیسے علامہ سے سر ہو گئے

حکومت انگلستان نے یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو علامہ اقبالؔ کی علمی اور فرہنگی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُنھیں "سر" کا خطاب دیا۔ چنانچہ ۱۷ جنوری ۱۹۲۳ء کو شام کے چار بجے مقبرہ جہانگیر شاہ باغ لاہور میں یہ پُرشکوہ محفل ضیافت برگزار ہوئی ۔ اس محفل کی صدارت پنجاب کے گورنر Sir E.Mclagen نے کی۔ اس محفل میں ملیٹری کمانڈروں کے علاوہ سر جان ضیارڈ، میاں فضل حسین وزیر تعلیم و آموزش، لالہ ہرکشن لال وزیر انڈسٹریز، نواب میر فتح علی خان، میاں احمد یار خان، سر ذوالفقار علی خان، راجہ نریندر ناتھ اور چودھری شہاب الدین شامل تھے۔ یونیورسٹی اور مدارس کے مختلف اساتذہ اور طالب علموں کے ساتھ ساتھ خاصی تعداد میں ہندوستانی اور یورپائی خواتین بھی اس بزم میں شریک تھیں۔ اس محفل میں شرکت دعوت نامہ پر منحصر تھی۔ ضیافت شام کے بعد طالب علموں نے علامہ اقبالؔ کی نظم "ترانہ ہندی" پڑھی۔ سر ذوالفقار علی خان نے اپنی تقریر میں علامہ اقبالؔ کی علمی وادبی سماجی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ برصغیر میں رابندر ناتھ ٹیگور کے نوبل پرائز کے بعد دوسری شخصیت جس کی خدمات کا صحیح اعتراف کیا گیا ہے وہ علامہ اقبالؔ ہیں۔ علامہ نے انگریزی زبان میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ مغربی حکومتیں اس دور میں علوم مشرقیہ پر توجہ کر رہی ہیں چنانچہ مجھے یہ خطاب دے کر حکومت انگلستان نے اُردو اور فارسی کے ادیبوں کی قدردانی اور ان کا احترام کیا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے ۲۴ جنوری ۱۹۲۳ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو خط میں لکھا تھا کہ سر کا خطاب مجھے اسرار خودی کے اشعار سے متاثر ہو کر دیا گیا ہے ان اشعار کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے اور یورپ اور امریکہ میں ان اشعار پر تبصرے کیے گئے ہیں۔ اگرچہ پنجاب کے چیف جسٹس سر شادی لال نے کچھ مہینوں قبل علامہ اقبالؔ سے کہا تھا کہ میں آپ کو سر کے خطاب کے لائق سمجھا ہوں اور اس کے لیے حکومت انگلستان سے پیشکش کرنا چاہتا ہوں تو علامہ اقبالؔ نے فوری جواب دیا تھا کہ مجھے اس خطاب کی آرزو نہیں ہے اور خاص طور پر اس ضمن میں آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتا۔ تاریخی دستاویز سے یہ بات ظاہر ہے کہ جسٹس شادی لال کو علامہ اقبالؔ سے خصومت تھی اور وہ علامہ کی بڑھتی ہوئی شہرت سے

حاسد تھے چنانچہ جب شادی لال کو معلوم ہوا کہ حکومت انگلستان نے علامہ اقبالؔ کو سر کے خطاب کے لیے انتخاب کر لیا ہے تو وہ اپنی چابک فکری اور منافقانہ رویّہ سے اس کام کا سہرا اپنے سر لینا چاہتے تھے جس کو علامہ نے فوری رد کر دیا لیکن بعد میں گورنر پنجاب Sir McLagen کے اصرار پر اس خطاب کو اس لیے قبول کیا کہ یہ خطاب صرف علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جا رہا تھا۔ علامہ اقبالؔ نے اس خطاب کو قبول کرنے سے قبل یہ شرط بھی رکھی کہ پہلے ان کے استاد محسن مولوی میر حسنؔ کی خدمات کی قدر دانی شمس العلماء کے خطاب دے کے کی جائے۔ گورنر پنجاب کے سوال پر کہ مولوی میر حسنؔ کی کتنی تصانیف ہیں علامہ نے کہا کہ مولوی میر حسنؔ نے اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن میں مولوی میر حسن کی زندہ تصنیف و تالیف ہوں۔ علامہ اقبالؔ نے مزید کہا کہ اس خطاب کو عطا کرتے وقت انھیں لاہور آنے کی زحمت نہ دیں کیونکہ وہ ضعیف ہیں اور اس سفر میں زحمت ہو سکتی ہیں چنانچہ شمس العلماء کا خطاب مولوی میر حسنؔ کے فرزند کے سپرد کیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ کو یہ خطاب اُس وقت دیا گیا جب کہ خاص و عام ان خطبات کو مشکوک نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ علامہ کے بعض دوست بھی اِسے پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے ۔ چنانچہ لوگ اپنی فکر و ہمت کے پیمانوں پر علامہ کو تولنے لگے کہ اب اقبالؔ وہ اقبالؔ نہیں رہینگے ۔ عبدالمجید سالکؔ مصنف ذکرِ اقبالؔ لکھتے ہیں اس خطاب پر احتجاج کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خان نے کچھ معترضانہ اشعار لکھے اور اُسے مجلّہ زمیندار میں شائع کیے جو زبان زدہ عام ہو گئے۔

لو مدرسۂ علم ہوا قصرِ حکومت — افسوس کہ علامہ سے سر ہو گیے اقبالؔ
پہلے تو سرِ ملّت بیضا کے تھے وہ تاج — اب اور سُنو تاج کے سر ہو گئے اقبالؔ
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ — سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبالؔ

اقبالؔ کے دوست جناب عبدالقادر گرامی جنھوں نے اقبالؔ کے فارسی اشعار پر اصلاح دی وہ بھی پہلے ناراض ہو گئے اور کہا۔

کرد اقبالؔ را حکومت سرد — عقل علامہ سوخت سوختہ بہ

لیکن چند سال بعد مطمئن ہو کر یہ اشعار لکھے اور اقبالؔ کو سراہا۔

ہر نکتہ علامہ وفا آہنگ است ہر حرف کلید وحکمت فرہنگ است
اقبالؔ کہ اقبالؔ شد از جوہر علم حاسد او او کند علاجش سنگ است

علامہ اپنے قدیم دوست میر غلام نیرنگ کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں کہ "قسم اللہ کی جس کے ہاتھ میری جان اور آبرو ہے اور قسم اُس کے رسولؐ پاک کی جس کے ارشادات سے میں خدا پر ایمان لایا اور مسلمان ہوا، دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر اقبالؔ کی ظاہری زندگی مومنانہ نہیں مگر اس کا قلب تو ہمیشہ کی طرح مومن رہے گا"۔ اقبالیات کے محققین نے بھی یہ بات دلائل سے ثابت کر دی ہے کی علامہ کے خطاب کو قبول کرنے کی مصلحت دفاعی عمل تھا کیوں کہ اُس زمانے میں مسلمان عجیب افسردگی اور عقب ماندگی کا شکار ہو چکے تھے اور دوسری قومیں انگریز دوستی اور تعلیم تحصیل میں ترقی کر کے بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ حقیقت میں علامہ اقبالؔ ان مسائل سے بہت دور رہتے تھے۔ چنانچہ جب مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۰ء میں علامہ اقبالؔ کو خط میں لکھا کہ آپ دانشگاہ ملی کی سرپرستی کو قبول کر کے اُسے اپنی صحیح رہنمائی سے ترقی دیں تو اقبالؔ نے جواب میں لکھا کہ اگرچہ میں مسلمان قوم کی تعلیم کی شدت سے حمایت کرتا ہوں لیکن میں ان رقابتوں اور فضول کشمکشوں میں کام انجام نہیں دے سکتا۔

اس موقع پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض افراد غلط فہمی کا شکار ہو کر Noble Prize کے بارے میں ٹیگور اور اقبالؔ کو ایک دوسرے کا حریف قرار دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اقبالؔ کو مسترد کر کے ٹیگور کو نوبل پرائز کا مستحق قرار دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ کا نام کبھی رسمی طور پر نوبل کمیٹی کے سپرد نہیں کیا گیا تھا۔ ٹیگور اقبالؔ سے (۱۸) سال بڑے تھے اور ۱۴ نومبر ۱۹۱۳ء کو ٹیگور کو نوبل انعام مبلغ ایک لاکھ دس ہزار سکہ ہند عطا کیا گیا جو ٹیگور کی کتاب "گیتا نجلی" کے انگریزی ترجمے اور اُن کے سماجی خدمات کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ کے مقام میں نوبل انعام نہ ملنے سے کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اگر ٹیگور کے پاس ذات اور انسانیت کے بارے میں گفتگو ہونے کی وجہ

سے انھیں نوبل پرائیز کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے تو علامہ اقبال کا کلام جو کائنات اور رہنمائی انسانیت کے بیانات سے لبریز ہے اس سے بھی اعلیٰ انعام کا حقدار ہوسکتا ہے۔ شمالی امریکہ کے مشہور شاعر، محقق اور نقاد جناب ڈاکٹر عروج زیدی کے تین شعر جو موصوف کی نظم اقبال سے ہیں ہم یہاں پر پیش کر کے اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہیں۔

گیتانجلی کی بزم کہاں اور تو کہاں — برگ حنا کا رنگ کہاں اور لہو کہاں
میخانۂ رموز میں یہ ہائے ہو کہاں — انعام خسروی کی یہاں آبرو کہاں
نیگور کے پیام کی جو کائنات ہے — وہ تیرے فکر و فن میں فقط اک بات ہے

معلم اقبالؔ شمس العلما میر حسن

علامہ اقبالؔ کی ساٹھویں برسی کی نسبت سے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اُن کے شفیق اُستاد شمس العلما میر حسنؔ کا تذکرہ کروں تا کہ اُستاد اور شاگرد کی روحیں بھی شاد ہوں اور ہمارے درمیان اُن کی یادیں بھی آباد رہیں۔ شمس العلما سید میر حسن کی پہلی ملاقات علامہ اقبالؔ سے اُس وقت ہوئی جب علامہ کی عمر صرف چار سال چار مہینے تھی۔ اقبالؔ کو اُنکے والد شیخ نور محمد نے صرف مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے غلام حسن کے مکتب میں روانہ کیا تھا جو سیالکوٹ کے محلہ شوالہ کی مسجد میں واقع تھا۔ ایک دن مولوی میر حسن مکتب آئے اور جب اُن کی نگاہ اُس کمسن بچے پر پڑی جس کی پیشانی کشادہ، جس کے بھورے رنگ کے بال اور جس کا چہرہ معصومیت سے لبریز تھا تو آپ نے پوچھا کہ یہ کس کا بچہ ہے؟ اور پھر اقبالؔ کے والد شیخ نور محمد کے پاس جا کر اُنھیں سمجھایا اور راضی کیا کہ بچوں کے لیے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم جدید کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ چنانچہ خود مولوی میر حسن نے اقبالؔ کو سکاچ میشن کے مدرسہ میں داخل کیا جہاں سے آپ نے میٹرک پاس کیا۔

مولوی سید میر حسن ۱۸۴۴ء میں پنجاب میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں انتقال فرمایا۔ آپ نے تقریباً ۸۵ سال عمر پائی۔ علامہ اقبالؔ نے ۴۸ سال تک اس شفیق اُستاد سے فیض اُٹھایا اور اُن کی آخری عمر تک احترام کیا اور خدمت گذاری انجام دی۔

کتاب ''روزگار فقیر'' تالیف سید وحیدالدین، ''علامہ سر اقبالؔ'' تالیف شیخ آفتاب احمد کے علاوہ ''ذکر اقبالؔ'' اور ''نیرنگ خیال'' میں لکھا ہے کہ مولوی میر حسن ایک راسخ الاعتقاد مسلمان اور باعمل مومن تھے۔ وہ حافظ قرآن بھی تھے۔ مولوی صاحب علوم اسلامی، عرفان اور تصوف میں ید طولیٰ رکھتے ہوئے علوم جدید ادبیات، زبان اور ریاضیات میں ماہر تھے۔ ہزاروں اشعار عربی، فارسی، اُردو اور پنجابی میں زبانی یاد تھے۔ نماز صبح کے بعد ہر روز پہلے قبرستان جا کر عزیزوں اور دوستوں کے لیے فاتحہ پڑھتے، گھر پہنچ کر ناشتہ کرتے اور پھر تعلیم کا سلسلہ شروع ہوتا۔ شاگردوں کو گھر پر تعلیم دیتے، پھر مدرسے میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے۔ شام کو جب بازار جاتے تو شاگرد ساتھ ساتھ رہتے اس طرح

اُستاد اور شاگردوں کا یہ قافلہ راہ کسب علم میں ہر صبح سے دیر گئے رات تک گامزن رہتا۔ مولوی میر حسن متین، قناعت پسند، متواضع، خوش اخلاق اور پاک صفت انسان تھے۔ آپ کی زندگی سادہ اور لباس معمولی اور پاکیزہ ہوتا تھا۔ آپ کی تنخواہ جو مدرسہ سکاچ میشن سے ملتی تھی کبھی (۱۲۰) روپیوں سے زیادہ نہیں رہی۔ علامہ اقبال نے بہت سی اخلاقی خصوصیات اور قلبی وارادات کو اپنے استاد ہی سے حاصل کیا تھا۔ علامہ میر حسن کی بہت عزت کرتے تھے اور انھیں ہمیشہ ''شاہ صاحب'' کہہ کر یاد فرماتے۔ احترام کا یہ حال تھا کہ پہلے پہل استاد کے سامنے کبھی شعر پڑھنے کی جرات نہیں کی لیکن بعد میں جب مولوی صاحب نے شعری ترغیب کی اور فن شعر کی تعلیم دی تو اُن سے بھرپور استفادہ کیا اور میر حسن صاحب ہی کے مشورے سے حضرت داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔

ڈاکٹر جاوید اقبال ''زندہ رود'' میں رقم کرتے ہیں کہ ایک دفعہ مولوی صاحب کے ساتھ اقبال بازار گئے مولوی صاحب کے کسی عزیز کا چھوٹا بچہ جسکا نام احسان تھا ساتھ ہو گیا۔ احسان بہت موٹا تھا مولوی صاحب نے اقبال سے کہا کہ بچے کو گود میں اُٹھالو، کچھ راستہ چل کر اقبال نے اُسے دکان پر اُتارا اور تھکن دور کرنے لگے۔ مولوی صاحب متوجہ ہوئے اور کہا اقبال اس چھوٹے بچے کو بھی اُٹھانا تمہارے لیے مشکل ہے؟ اقبال نے فوراً جواب دیا ''شاہ صاحب آپ کا احسان بہت سنگین ہے''۔

علامہ اقبال کے دل میں اپنے استاد کی قدر و منزلت اور محبت کس قدر تھی اُن اشعار سے چھلکتی ہے جو موصوف نے ۱۹۰۵ء میں انگلستان روانہ ہوتے وقت خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار پر نظم التجائے مسافر میں لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

وہ شمع بارگہ خاندانِ مرتضویؑ — رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجکو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں — کرے پھر اُس کی زیارت سے شادماں مجکو

شمس العلما میر حسن، سر سید احمد خان کے حامیوں میں سے تھے۔ چنانچہ جب سر سید اپنے نواسے سر راس مسعود کے ہمراہ پنجاب آئے تو میر حسن صاحب نے اقبال کا تعارف سید احمد خان اور سر راس

مسعود سے کروایا چنانچہ اسی ملاقات کے بعد آخری عمر تک اقبالؔ اور راس مسعود صمیمی دوست اور ہمظفر رفیق بنے رہے۔

۱۸۹۸ء میں جب سرسید کے انتقال کی خبر سیالکوٹ پہنچی تو علامہ اقبالؔ تعطیلات گزارنے کے لئے سیالکوٹ لاہور سے آئے ہوئے تھے۔ مولوی میر حسن نے مادہ تاریخ نکالنے کے لیے کہا تو اقبالؔ نے چند ہی گھنٹوں میں "انی متوفیك ورافعك الی ومطهرك "مادہ تاریخ استخراج کیا۔ اور خود میر حسن نے "غفر له" تاریخ نکالی۔ مولوی میر حسنؔ کے بڑے بیٹے سید محمد تقی شاہ اور اُن کے چھوٹے بیٹے سید محمد ذکی شاہ سے علامہ کا یارانہ تھا اور دن رات اِن کے ساتھ بچپنے اور جوانی میں اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ مولوی میر حسن کے نواسے جناب سجاد حیدر آج بھی لاہور میں بقید حیات ہیں۔

مشہور واقعہ ہے کہ جب ۱۹۲۳ء میں حکومت برطانیہ نے علامہ اقبالؔ کو سر کا خطاب عطا کرنے سے آگاہ کیا تو علامہ نے پنجاب کے گورنر جنرل سے کہا کہ جب تک اُن کے استاد میر حسنؔ کی قدر دانی نہیں کی جائے گی وہ کسی قسم کا اعزاز قبول نہیں کریں گے۔ گورنر نے پوچھا کہ مولوی صاحب کی کوئی تصنیف بھی ہے؟ علامہ نے جواب دیا ''میں خود اُن کی تصنیف ہوں''۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے مولوی میر حسنؔ کو شمس العلما کا خطاب دے کر علامہ کو ''سر'' کا خطاب دیا۔ علامہ اقبالؔ چار سال سے ۵۲ سال کی عمر تک اپنے استاد میر حسن سے وابستہ رہے۔ ہمیشہ اُن سے ملتے جلتے رہتے اور اپنے ہر کام میں اُن سے مشورہ کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا بھی یہی حال تھا کہ اپنے شاگرد کی شہرت اور کامیابی دیکھ کر جذباتی ہو جاتے کہ جب بھی اقبالؔ کا نام بھی آجاتا تو خوشی کے آنسو نکل جاتے۔ کیا دنیا میں کسی اور اُستاد اور شاگرد کا ایسا مخلصی رشتہ ہوسکتا ہے۔ صحیح کہا ہے

دل بہ دل راہ دارد

جب ۱۹۲۹ء میں (۸۵) سال کی عمر میں شمس العلما میر حسن نے داعی اجل کو لبیک کہا تو علامہ اقبالؔ نے مادہ تاریخ استخراج کی۔ "ما ارسلنك الا رحمته للعالمين" یہ سچ ہے کہ یہ رحمت للعالمینؐ ہی کی رحمت تھی جس نے مولوی میر حسن جیسے شفیق استاد کو علامہ کے لئے رحمت بنا کر بھیجا تھا۔

علامہ اقبالؔ مشاہیر عالم کی نگاہ میں

علامہ اقبالؔ برصغیر کی وہ اہم شخصیت تھے جنھیں اپنی زندگی میں شہرت دوام حاصل ہو چکی تھی۔
اس خصوصی مضمون میں ہم بعض مشاہیر کے اقوال اور بعض عظیم شعرا کے اشعار پیش کریں گے جو اگرچہ مشتی از خروار محسوب ہوتے ہوئے بھی علامہ کی شخصیت کے پرتو کو واضح کرنے کے لئے سوانح عمری کے راستے پر سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، کیوں کہ یہ افراد مختلف ملک، قوم، زبان، تمدن اور مکاتیب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

قایداعظم محمد علی جناح نے فرمایا'' شعر املت کے بدن میں تازہ روح پھونکتے ہیں۔ ملٹن، شیکسپیر اور بائرن وغیرہ نے اپنی ملت کی بڑی خدمتیں کیں ہیں۔ کارلائل اپنی تصنیف میں شیکسپیر کی بزرگی کا اقرار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب اُسے اختیار ہے کہ شیکسپیر یا حکومت برطانیہ کو انتخاب کرے تو وہ کسی بھی قیمت پر شیکسپیر سے دست بردار نہ ہوگا۔ اگرچہ میں سلطنت نہیں رکھتا لیکن اگر سلطنت حاصل ہو جائے اور مجھ سے کہیں کہ سلطنت یا اقبالؔ کو انتخاب کروں میں حتماً اقبالؔ کو انتخاب کروں گا۔
دور حاضر میں دین اسلام کو کسی نے بھی اقبالؔ سے خوب تر اور بہتر درک نہیں کیا۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ مجھے یہ موقع ملا کہ میں اقبالؔ کی رہبری میں ایک سپاہی کی طرح کام کرسکوں۔ میں نے اس دور میں اقبالؔ سے بڑھ کر کسی اور کو اسلام کا رفیق باوفا اور شیدا نہیں دیکھا''۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا۔'' اقبالؔ کی ذہانت اور ہندوستان کی آزادی سے محبت نے مجھے بہت متاثر کیا ان کی عظیم نظمیں آنے والی نسلوں کے دلوں میں ان کی یاد تازہ رکھیں گی اور انھیں فیض پہونچاتی رہیں گی''۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔'' ڈاکٹر اقبالؔ کی موت سے جو عمیق زخم دنیائے ادب کے جسم پر لگا ہے اُس کے پُر ہونے کے لئے لمبی مدّت درکار ہے۔ آج کل ہندوستان کا رتبہ دنیائے ادب میں اتنا کم پایہ ہے کہ ہم کسی صورت ایسے عظیم الشان شاعر کی شاعری سے دستبردار نہیں ہو سکتے جس کی شاعری کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے''۔

پروفیسر آرنلڈ برطانوی کہتے ہیں "اگرچہ اقبال میرے شاگرد ہیں لیکن میں ان کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہوں۔ ہندوستان نے اپنی حرکت تجدید اقبال کے اشعار سے حاصل کی۔ اقبال دوسرے لوگوں کے خیالات کی بازگشت نہیں بلکہ ایک اور بیحد مجتہد اور مفکر ہیں"۔

ڈاکٹر نکلسن لکھتے ہیں "اقبال کے اشعار نے مسلم جوان کو بیدار اور باخبر کر دیا ہے چنانچہ بعض نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس مسیحا کے وہ منتظر تھے وہ مسیحا آچکا ہے"۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری نے کہا۔ "اقبال ایک ایسے عظیم شاعر ہیں جنھوں نے اپنی عظمت جہان اسلام پر ثابت کر دی ہے"۔

سر تیج سپرو لکھتے ہیں۔ "اقبال کے ساتھ وہ لوگ بہت بے انصافی کرتے ہیں جو یہ بات کہتے ہیں کہ وہ محض ایک اسلامی شاعر تھا۔ یہ کہنا اُس کے دائرہ اثر کو محدود کرنا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اسلامی فلسفہ، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا لیکن کسی نے آج تک ملٹن کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ عیسائی مذہب کا شاعر ہے، کالیداس ہندو مذہب کا شاعر ہے ان کے اثر کو محدود نہ کیا اور نہ اور مذہب کے لوگوں نے اس وجہ سے ان کی قدر دانی میں کمی کی"۔

علامہ سعید نفیسی تہرانی نے کہا۔ "اقبال آسمان پاک پر چمکنے کے ساتھ ساتھ اپنی روشنی ایران پر ڈال رہا ہے اور یہ امر بالکل قدرتی ہے کیونکہ ایران، پاکستان نزدیک اور دیوار بہ دیوار سہارے ہیں اور آفتاب ہر دو گھروں کو ایک وقت میں روشنی دیتا ہے۔ اس جہان میں روشنی اور نور پھیلانے والا خورشید پاکستان کا عظیم شاعر محمد اقبال ہے جو نو سو سال کے ہند و ایران کی فارسی روایات کا وارث ہے"۔

مولانا محمد جوہر کہتے ہیں۔ "اقبال بیسوی صدی کے ہندوستان میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا شاعر ہے۔ اسلامی ہندوستان سب سے زیادہ پنجاب کے اس شرمیلے حیادار اور خلوت پسند بیرسٹر کا احسان مند ہے تمام اُردو بولنے والے اس کے نام سے آشنا ہیں اور میں اس کا چاہنے والا اور پرستار ہوں"۔

مہاراجہ کشن پرشاد کہتے ہیں۔ "اقبال جس بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے وہ اس کا جائز حق ہے اس کا پیغام فرزندان مشرق کبھی فراموش نہ کر سکیں گے"۔

ہربرٹ ریڈ انگلیسی لکھتا ہے۔ ''اگر شعرا عصر کو میزان صداقت ماورٰی طبیعات پر پرکھیں تو ہمیں صرف ایک شاعر نظر آتا ہے جو ہماری نسل اور قوم سے نہیں۔ میری مراد محمد اقبال ہیں جن کی نظم اسرار خودی کا ترجمہ ڈاکٹر نکلسن نے کیا ہے''۔

علامہ شبلی نے ۱۹۱۱ میں اقبال کو برصغیر کا ملک الشعرا کہا تھا۔

ڈاکٹر منوچہر اقبال وزیر ایران کہتے ہیں ''عام طور پر اقبال کو پاکستان کے ایک فلسفی شاعر اور ہنرمند سخن سرا کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کے حالات اور اس کے کلام کی طرف صحیح طور پر توجہ دی جائے تو معلوم ہوگا کہ اقبال محض ایک مخصوص قوم یا ملک کا شاعر نہیں بلکہ عالمی شخصیت کا مالک اور عالم انسان کا رہنما ہے''۔

سید سلیمان ندوی کہتے ہیں ''شاید کم لوگ آگاہ ہیں کہ اقبال نے ایک صوفی خاندان میں آنکھیں کھولیں ان کے والد ایک خوش مشرب صوفی تھے ان کے دوست احباب بھی صوفی منش تھے چنانچہ اقبال نے اس صوفیانہ ماحول میں پرورش و تربیت پائی۔ اقبال صرف شاعر نہ تھے بلکہ وہ حکیم تھے جو اسرار کلام الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے آشنا تھے۔ وہ بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتے تھے''۔

ابوالکلام آزاد نے کہا ''جدید ہندوستان ان سے بڑا شاعر پیدا نہیں کر سکا۔ ان کی فارسی شاعری بھی جدید فارسی ادب میں اپنا مقام رکھتی ہے''۔

مولانا خواجہ حسن نظامی کہتے ہیں۔ ''اقبال نے جمعرات کے دن ۱۹ صفر ۱۳۵۷ھ صبح صادق کے وقت اس دنیا سے کوچ فرمایا وہ چونکہ محب اہلبیتؑ تھے اس لئے قدرت نے ان کو چہلم سید الشہدا سے ایک دن پہلے کی تاریخ عطا فرمائی''۔

ڈاکٹر عبدالوہاب مصری لکھتے ہیں ''اگر جلال الدین رومی دوبارہ زندہ کئے جائیں تو اُن کی صورت و شخصیت حتماً علامہ اقبال ہوگی۔ ساتویں صدی کے جلال رومی اور چودھویں صدی کے محمد اقبال ایک ہی تصور کئے جائیں''۔

فیض احمد فیض کہتے ہیں ''اقبال ایسا ہے کہ اُسے پڑھتے وقت کوئی اور چیز نظر میں نہیں جچتی، یہ محسوس ہوتا

ہے کہ بس شاعر ہی وہ ہیں۔ فکر اور شعر دونوں میں ہمہ گیری اور آفاقی ہے''۔
مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ''علامہ کی شخصیت عالمگیر تھی وہ سب سے بڑا مسلمان اور سب سے بڑا برصغیر کا باشندہ تھا جو چشم خود بست و چشم ما کشاد''۔
قاضی نذر الاسلام بنگلہ دیشی۔ ''اقبال کی عظمت ایسی ہے کہ آج کل اُردو زبان افراد کی زبان پر صرف اقبال کا ذکر جاری ہے''۔
ایران کے عظیم شاعر اور ملک شعرا بہار خراسانی نے چند معرکتہ آرا اشعار اقبال کے لئے لکھے۔

بیدلی گر رفت اقبالی رسید   بیدلان را نوبت حالی رسید
این سلامی مسطر ستم سوئی یار   بی ریا تر از نسیم نو بہار
قرن حاضر خاصہ اقبال گشت   واحدی کز صد ہزاراں بر گذشت
شاعراں گشتند جوں تار مار   ویں مبارز کرد کار صد ہزار

یعنی جب بیدلی (بیدل) گذر گئی تو اقبالی (اقبال) پہنچے جس سے بیدلوں میں جان پڑ گئی۔
یہ پیغام سلامتی دوست کی طرف روانہ کررہا ہوں جو نسیم بہار کی طرف بے ریا ہے۔
موجودہ زمانہ خاص طور پر اقبال کا زمانہ ہے۔ اقبال تنہا لاکھوں سے بازی لے گیا۔
شعرا ایک پامال شدہ فوج کے مانند تھے مگر اس جنگجو نے سینکڑوں سواروں کا کام کیا۔
مولانا غلام قادر گرامی کہتے ہیں۔

در دیدۂ معنی نگہان حضرت اقبال   پیغمبری کرد و پیغمبر نتوان گفت

حضرت اکبر الہ آبادی خواجہ حسن نظامی اور علامہ کی تعریف میں کہتے ہیں۔

حضرت اقبال اور خواجہ حسن   پہلوانی ان میں ان میں بانکپن
اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد   قومی رکنوں کے ہیں نگہبان وہ بھی
تم محو ہو حسن کی تجلی میں اگر   ہیں دشمن فتنہ رقیباں وہ بھی
پریوں کے لئے جنوں ہے تم کو اگر   دیووں کے لئے ہے سلیماں وہ بھی

مولانا حامد حسن قادری نے میر غالب اور اقبال کا موازنہ خوب کیا ہے۔

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے — جن کی فیض طبع نے اُردو کو گنج زر دیا
اک اثر میں بڑھ گیا اک رفعت تخئیل میں — تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا

فیض احمد فیض کے دو قطعات اقبال پر۔

سنی واماندۂ منزل نے آواز درا آخر — ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحر خاموشی
مئے غفلت کے ماتے خواب دیرینہ سے جاگ اٹھے — خود آگاہی سے بدلی قلب و جہاں کی خود فراموشی
نمود کے سب راز تو نے پھر سے بتلائے — ہر اک فطرت کو تو نے اس کے امکانات جتلائے
ہر ایک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تو نے — ہر اک ذرے کو ہم دوش ثریا کر دیا تو نے

محسن احسان نے ایک نظم "نوا را تلخ ترمی زن" اقبال کے نام لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

تو عشق کا درس دینے آیا — ہم لوگ ہوس پرست نکلے
پرویزی و خواجگی سجائے — ہم اپنے نشے میں مست نکلے
شاہین ترا شاہ پارۂ ذہن — ہم مور و مگس سے پست نکلے
چندھیا گئیں روشنی سے آنکھیں — جب غیر سحر بدست نکلے
پیغمبر مشرق جو شکایت — تھی تجھ کو مجھے بھی آج تک ہے

احمد ندیم قاسمی بخدمت اقبال لکھتے ہیں

جس قدر امت مسلم پہ کرم ہیں تیرے — اتنے ہی ملت آدم پہ ہیں تیرے احسان
عہد فردا میں جو تاریخ لکھی جائے گی — ترے شعروں سے چنے جائیں گے اُس کے عنوان
مجھ کو دعویٰ ہے کہ اس دور کا شاعر ہوں مگر — شعر کہتا ہوں تو یاد آتا ہے تیرا فرمان

علی صادق سرمد نے کہا

گرچہ مرد بہ میرد بہ گردش مہ و سال — نمردہ است و نمی میرد محمد اقبال

نواب بہادر یار جنگ کہتے ہیں "کسی کا سعدی کوئی اور ہو تو ہو میرا سعدی اقبال ہے"۔

ای ایم فاسٹر لکھتا ہے۔ ''اقبالؔ کٹر مسلمان تو تھا مگر وہ روایات کا پرستار نہ تھا۔ اس کے خیالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہو مگر وہ انتہا پسند نہ تھا۔ اُس نے ہمیشہ ہندوؤں اور عیسائیوں کا ادب واحترام کیا ہے''۔

سابق صدر بھارت ڈاکٹر رادھا کرشنن کہتے ہیں۔ ''اقبالؔ نے اسلام کی اصلی روح کو پیش کر کے مارکسی مادیت اور موجودیت کے حملوں کے بالمقابل مذاہب کی مدافعت اور حمایت کی ہے''۔

ایران کے رہبر اور سابق پریسڈنٹ آیت اللہ خامنہ ای کہتے ہیں ''علامہ اقبالؔ کی اسلام دوستی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انھوں نے Edward Brown کی Literary History of Persia اور Arnold کی An Invitation to Islam اس لئے ترجمہ نہیں کی کہ اُن کتابوں کی تہہ میں چھپی برطانیہ پالیسی جس میں جہاد کو غیر ضروری مسئلہ قرار دیا گیا تھا۔ قرآنی تعلیمات اور احادیث نبویؐ کو اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں پھیلانے کے لئے اقبالؔ کے کلام سے آشنائی اور اس کی اشاعت ضروری ہے کیوں کہ اسلام کی طرح اقبالؔ کا کلام بھی تمام انسانیت عالم کے لئے ہے۔ علامہ اقبالؔ کی اس سے بڑی عظمت کی مثال کیا ہوگی کہ وہ شخص جس نے کسی دنیاوی قدرت کے سامنے کبھی سر خم نہیں کیا وہ مسلمانوں کے آگے اتحاد اسلامی کے لئے دست دراز اور جھکا ہوا نظر آتا ہے''۔

اس مضمون کے اختتام پر ہم میکشؔ، وجدؔ اور مخدومؔ محی الدین کے اشعار جو اقبالؔ کے اعتراف میں لکھے گئے پیش کرتے ہیں۔

میکشؔ۔ سونے والوں کو پیام صبح جو دیتی ہوئی — خواب کی دنیا اٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی
مطلع مشرق پہ چمکا آفتاب شاعری — ہر کرن جس کی بنی تار رباب شاعری
قلب شاعر سے صداقت لے کے نکلی شاعری — سچ کہا ہے شاعری جزویست از پیغمبری

وجدؔ۔ ترا ہر شعر دل کی سمت پورا وار ہے گویا — زبان پاک تیری تیغ جوہر دار ہے گویا
جہاں میں نام پیدا کر لیا ہے ہم نشینوں نے — کئی خرمن بنا ڈالے ہیں تیرے خوشہ چینوں نے

مخدومؔ۔ اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گانے لگا — جانب مشرق اجالا سا نظر آنے لگا
عرش کی قندیل ہے اک آسمانی راگ ہے — راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے

ٹیپو سلطان اور علامہ اقبالؔ

۱۱ر جنوری ۱۹۲۹ء گیارہ بجے دن علامہ اقبالؔ نے ٹیپو سلطان کے مقبرہ گنبد سلطانی پر حاضری دی' جو سری رنگ پٹن میسور میں واقع ہے۔ گنبد سلطانی پر مہاراجہ میسور کرشنا وڈیر کے حکم سے روز آنہ نوبت بجائی جاتی تھی۔ گنبد سلطانی سنگ مرمر، سنگ سیاہ اور سنگ یشیب سے بنائی گئی ہے۔ اس میں موجود تین قبریں اپنی شان و شوکت کی داستانیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ قبریں ٹیپو سلطان شہید، ان کے والد حیدر علی خان اور ان کی والدہ فاطمہ کی ہیں۔ اقبالؔ روضۂ سلطانی کے ایک کتبے کی رباعی پڑھ کر بہت متاثر ہوئے جس میں شہید ٹیپو سلطان کے والدین حیدر اور فاطمہ کے نام کی مناسبت سید الشہدا امام حسین علیہ سلام کے والدین سے تھی۔

آں سید الشہدا عرب سبط نبیؐ = لخت جگر فاطمہؑ و جان علی
از فاطمہ وحیدر دکنی ٹیپو = سلطان شہیداں شد از جان و ولی

علامہ گنبد سلطانی میں شاہی محل کے عہدیداروں، سرکاری افسروں اور عمایدین میسور سے مختصر سلام اور تعارف کرنے کے بعد گنبد میں داخل ہوئے اور اُس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور کوئی دو ڈھائی گھنٹے ٹیپو کے مزار پر تنہا مراقبہ میں گذارے۔ اس عرصے میں تمام عمایدین و عہدہدار اور احباب گنبد سلطانی کے صحن میں اقبالؔ کے منتظر رہے۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد جب علامہ باہر آئے تو اُن کی آنکھیں شدت گریہ زاری سے سوجھی ہوئی تھیں۔ گنبد سلطانی کے صحن میں مہاراجہ کے درباری موسیقار علی جان نے اپنی دل سوز آواز میں جب علامہ کا کلام سُنایا تو تمام حاضرین پر رقت طاری ہوگئی۔ علی جان نے یہ حالت دیکھ کر گانا بند کر دیا تو فوراً اقبالؔ نے کہا۔ علی جان کیوں رک گئے خدا کے لئے جاری رکھو۔ چناں چہ کچھ مدت تک یہ گریہ اور اشک باری کا سلسلہ جاری رہا۔ جب یہ محفل ختم ہوئی تو بنگلور کے مشہور قومی کارکن محمد عباس سیٹھ نے علامہ سے پوچھا۔ آپ نے روضہ سلطان شہید پر بڑی دیر تک مراقبہ فرمایا ہمیں بھی بتائے کہ مزار سلطان شہید سے آپ کو کیا فیض حاصل ہوا۔ علامہ نے فرمایا مزار پر میرا ایک لمحہ بھی بیکار نہیں گذرا۔ وہاں ایک پیغام الہامی مجھے ملا اور پھر اقبالؔ نے فی البدیہہ یہ فارسی کا

شعر پڑھا۔ ؎ در جہاں نتوان اگر مردانہ زیست ۔ ہمچو مردان جان سپردن زندگیست

(ترجمہ) اگر دنیا میں مردانہ طور زندگی میسّر نہ ہو تو مردانہ وار موت کو آغوش میں لینا خود زندگی ہے۔

علاّمہ کا یہ شعر ٹیپو سلطان کے اُس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جب اُن کے کسی مصاحب نے ٹیپو کو مشورہ دیا تھا کہ وہ انگریزوں سے صلح کرلیں۔ سلطان شہید نے فوراً کہا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔ علامہ اقبالؔ نے لاہور پہنچ کر اس فی البدیہ شعر پر چار اشعار کا اضافہ کیا جو اُن کی قلبی واردات تھی۔ یہ اشعار علامہ کے کلیات یا باقیات میں موجود نہیں بلکہ محمود بنگلوری کی کتاب ''تاریخ سلطنت خداداد'' شہاب یزدانی کی کتاب ''گلدستۂ اقبالؔ'' کے غیر مرتب نوادر میں شامل ہیں۔

آتشی در دل دگر بر کردہ ام — داستانی از دکن آوردہ ام
در کنارم خنجر آئینہ فام — می کشم اورا بہ تدریج از نیام
نکتہ ای گویم ز سلطان شہید — زان کہ ترسم تلخ گردد روز عید
بیشتر رفتم کے بوسم خاک او — تا شنیدم از مزار پاک او
در جہاں نتوان اگر مردانہ زیست — ہمچو مردان جان سپردن زندگیست

(ترجمہ۔ میرے دل میں جس چیز نے ایک نئی حرارت پیدا کردی ہے وہ ایک داستان ہے جو دکن سے لایا ہوں۔ میں اپنے پہلو سے ایک چمکدار تیز خنجر آہستہ آہستہ نیام سے کھینچ رہا ہوں۔ ٹیپو سلطان شہید کا ایک زرّیں قول کہنا چاہتا ہوں مگر مجھے ڈر ہے کہ کہیں عید کی خوشیاں تلخ نہ ہو جائیں۔ جب میں سلطان کی قبر کو بوسہ دینے لگا تو ان کے مزار سے یہ آواز آئی کہ اگر دنیا میں مردوں کی طرح زندگی کرنا محال ہو جائے تو مردانہ وار جان قربان کردینا ہی حیات جاوید ہے)

علامہ اقبالؔ نے مولانا رومؔ کے بعد سب سے زیادہ اشعار ٹیپو سلطان شہید پر لکھے اور ان اشعار کو اپنی سب سے اہم کتاب ''جاوید نامہ'' کا جزو بنایا۔ جاوید نامہ کے متعلق محمد جمیل بنگلوری کو ۱۴/ اگست ۱۹۲۹ء میں لکھتے ہیں۔ ''سلطان شہید پر میری نظم اس کتاب کا حصہ ہوگی جسے میں اپنی زندگی کا ما حصل

بنانا چاہتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں اس کے لئے آپ کو کافی انتظار کرنا پڑے گا"۔

میسور کی سلطنت کا بانی نواب حیدر علی خان کا بڑا بیٹا فتح علی خان جس کو ٹیپو سلطان اولیا کے نام پر ٹیپو سلطان کا نام دیا گیا ۱۵ر نومبر ۱۷۵۰ء میں کولار بنگلور میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۸۲ء میں اپنے باپ کے انتقال پر تخت نشین ہوا۔ ٹیپو سلطان کا تمام دور حکومت انگریزوں، فرانسیسیوں، مرہٹوں اور ان کے ہمدرد سلطنتوں سے لڑائی اور جنگ میں گذرا۔ جب ان تمام قوتوں کو جداگانہ فتح نصیب نہ ہوئی تو سب نے مل کر ٹیپو کے خلاف حملہ آوری شروع کر دی۔ انگریزی فوجیں ٹیپو کے فوجی سپہ سالار میر صادق کی غداری سے قلعہ میں داخل ہو گئی اور ٹیپو قلعہ کی مسجد میں لڑتا ہوا ۴ر مئی ۱۷۹۹ء کو شہید ہو گیا۔ ٹیپو سلطان کی تاریخ شہادت قطعہ "شمشیر گمشدہ" سے نکلتی ہے۔ دکن کے ایک نامعلوم شاعر نے اس واقعہ شہادت کی تاریخ ۱۲۱۳ھجری مطابق ۱۷۹۹ء نکالی جس میں نظام حیدر آباد اور اُن کے وزیر آعظم ارسطو جاہ اور اُن کے سپہ سالار میر عالم کے ناموں کے ساتھ انگریزوں کے آلہ کار ہونے کی وجہ سے مسٹر کے عنوان سے لکھا۔

مسٹر نظام و مسٹر اعظم یزید شد　　شمر لعین چہ مسٹر عالم پدید شد

تاریخ از شہادت سلطان حیدری　　"ٹیپو بہ وجہ دین محمدؐ شہید شد" (۱۲۱۳) ھجری

اس قطعہ کے آخری مصرع سے تاریخ نکلتی ہے۔

(ترجمہ۔ مسٹر نظام اور اُن کے وزیر آعظم یزید بن گئے۔ ان کے سپہ سالار مسٹر عالم شمر لعین بن کر ظاہر ہوئے اس واقعہ کی تاریخ اس مصرع سے نکلتی ہے کہ ٹیپو سلطان دین محمدؐ کی خاطر شہید ہو گیا)۔

بنگلور کے دورے کے درمیان علامہ نے آثار سلطانی کی بھی سیر کی۔ سلطان کا قلعہ، مسجد اعلیٰ قلعہ جس میں ٹیپو شہید ہوا تھا، سلطان کا قصر دریا دولت، باغ، میر صادق کی مفروضہ قبر اور غدار لنگڑے غلام علی وغیرہ کی قبر کا بھی دیدار کیا۔ جب کسی نے غدار لنگڑے غلام علی کی قبر پر اس کی تاریخ وفات کا شعر سُنایا تو اقبال پھڑک اٹھے۔

نیچ می دونی چہ دید از دست او اہل شہید　　آں چہ اولاد محمدؐ دید از دست یزید

یعنی جانتے ہو ٹیپو کے خاندان کا حال اُس غدار کے ہاتھ سے وہی ہوا جو خاندان محمدؐ کا حال یزید کے ہاتھ سے ہوا)۔

ان مقامات کی سیر سے متاثر ہو کر علامہ نے فرمایا ''مسلمانوں کو مغلیہ سلطنت کے بعد ایک نشاۃ ثانیہ کا موقع ملا تھا لیکن افسوس کہ غداروں نے اُسے بڑھنے نہ دیا''۔

علامہ اقبالؔ کی شعری تخلیقات میں جاوید نامہ کی حیثیت ممتاز اور منفرد ہے جو دو سال کی لگاتار محنت سے ۱۹۳۲ء میں تکمیل کو پہنچی۔ جاوید نامہ کی بابت خود اقبالؔ اپنے خط ۴ راگست میں فرماتے ہیں۔ ''سلطان شہید پر میری نظم اس کتاب کا حصّہ ہوگی جسے میں نے اپنی زندگی کا ماحصل بنانا چاہتا ہوں۔ جاوید نامہ میں تقریباً ۲ ہزار شعر ہوں گے''۔ اسی جاوید نامہ کو علامہ مصوّر بنانے کے بھی خواہش مند تھے چناں چہ اپنے مکتوب ۳۱ / مارچ ۱۹۳۳ء میں لکھتے ہیں ''اہم کام یہ ہے کہ جاوید نامہ کا تمام و کمال ترجمہ کیا جائے۔ مترجم کا اس سے یورپ میں شہرت حاصل کر لینا یقینی امر ہے۔ اگر وہ ترجمے میں کامیاب ہو جائے اور اگر اس ترجمے کو کوئی عمدہ مصوّر بنا دے تو یورپ اور ایشیا میں مقبول تر ہوگا۔ اس کتاب میں تخیلات نئے ہیں اور مصوّر کے لئے عمدہ مسالہ ہے''۔ پھر علامہ اپنے ایک اور خط مورخہ ۲۵ / جون ۱۹۳۵ء میں کاظمی کو لکھتے ہیں۔

''میرے خیال میں میری کتابوں میں صرف جاوید نامہ ایک ایسی کتاب ہے جس پر مصوّر طبع آزمائی کرے تو دنیا میں نام پیدا کر سکتا ہے۔ مگر اس کے لئے مہارت فن کے علاوہ الہام الٰہی اور صرف کثیر کی ضرورت ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب یہ چیز ایسی شان کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو دنیا یقینی طور پر اس کو کاظمی سکول کے نام سے موسوم کرے گی۔ آپ محض مصوّری میں اضافہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ دنیائے اسلام میں بحیثیت مصوّر اقبالؔ ایک زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جو کہ قدرت شاید آپ ہی سے لینا چاہتی ہے۔ پوری مہارت فن کے بعد آپ نے جاوید نامہ پر خامہ فرسائی کی تو ہمیشہ زندہ رہیں گے''۔

اگرچہ ہمارا موضوع اس مضمون میں جاوید نامہ نہیں ہے لیکن اس کا تذکرہ اس لئے لازم ہے کہ اسی

مثنوی میں سلطان شہید ٹیپو کی روداد شامل ہے۔علامہ نے جاوید نامہ کو شیخ محی الدین ابن عربی کے معراج نامے ''فتوحات مکیہ'' عربی نابینا شاعر ابوالعلا المصری کے ''رسالہ زعفران'' اور اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے کی ''ڈیوائین کامیڈی'' کو پیش نظر رکھ کر اپنا رویائی سفر کیا ہے یہ اُردو اور فارسی ادب میں بالکل جدید کاوش ہے۔یہ تخیلی خلائی سفر جو حالت خواب میں کیا گیا علامہ اقبال مولانا روم کی قیادت میں چھ افلاک یعنی فلک قمر، فلک عطارد، فلک زہرہ، فلک مریخ، فلک مشتری اور فلک زحل کے علاوہ افلاک کے آگے فردوس بریں کی سیر کرتے ہوئے مختلف روحوں سے ملاقاتیں کرتے ہیں جن میں زرتشت، گوتم، طالطائی، فرعون، ابوجہل، مہدی سودانی، منصور حلاج، ابلیس، نیٹشے، سید علی ہمدانی، شرف النسا، بھرتری ہری، نادر، ابدالی، ناصر خسرو اور ٹیپو سلطان قابل ذکر ہیں۔ اس تخیلی سفر کا نقطہ عروج سلطان ٹیپو سے ملاقات ہے چناں چہ اقبال نے رومی کے بعد ٹیپو سلطان اور ان سے متعلق موضوعات پر سب سے زیادہ اشعار لکھے ہیں جن کی تعداد (۸۰) سے زیادہ ہے۔علامہ کی گفتگو ٹیپو سلطان سے اس سفر کے سب سے آخر میں ہوتی ہے اس کے علاوہ ٹیپو نے جہاں میسور کے دریا کاویری کو زندہ رود کہا وہیں اقبال کو بھی زندہ رود نامزد کیا چناں چہ اس لئے اس تمام مثنوی میں اقبال نے اپنا لقب زندہ رود رکھا۔ملاقات ہوتے ہی ٹیپو سلطان علامہ سے پوچھتے ہیں۔

زائیرے شہر و دیارم بودہ ای　　چشم خود را بر مزارم سودہ ای
ای شناسای حدود کائنات　　در دکن دیدی ز آثار حیات

(ترجمہ۔تم نے میرے شہر اور سلطنت کی سیر و سیاحت کی ہے اور میری قبر پر گریہ زاری بھی کی۔یہ بتاؤ اے دور اندیش دانشمند کیا تم نے وہاں کچھ زندگی کے آثار بھی دیکھے)۔ اقبال نے جواب دیا۔

چشم اشکی ریختم اندر دکن　　لالہ ھا روید زخاک آن چمن
رود کاویری مدام اندر سفر　　دیدہ ام در جان او شوری دگر

یعنی میں نے وہاں آنسوؤں کی تخم ریزی کی ہے اور اب وہاں لالے کی فصل اُگے گی۔وہاں جو دریائے کاویری مسلسل سفر میں ہے۔اس کے بہاؤ میں میں نے ایک نیا شور اور ہیجان دیکھا۔یہ سُن کر ٹیپو

سلطان نے کہا۔

ای ترا دادند حرف دل فروز — از تپ تو می سوزم ہنوز
آن نوا کز جان تو آید برون — می دھد ہر سینہ را سوز درون
بودہ ام در حضرت مولای کل — آنکہ بی اوطی نمی گردد سبل
گرچہ انجا جرات گفتار نیست — روح را کاری بجز دیدار نیست
سوختم از گرمئی اشعار تو — بر زبانم رفت از افکار تو
گفت این ہمتی کہ برخواندی زکیست — اندر و ھنگامہ ہای زندگی ست
باھمان سوزی کہ در سازد بہ جان — یک دو حرف از مابہ کاویری رسان
در جہان تو زندہ رود او زندہ رود — خوشترک آید سرود اندر سرود

(ترجمہ۔ خدا نے تم کو دلوں کو گرمانے والا سخن عطا فرمایا ہے اسی لئے آنسوؤں کی حرارت مجھے گرما رہی ہے۔ تمہارے اشعار سے ہر سینہ روشن ہے۔ میں مولا کی خدمت میں تھا جہاں کسی کو بات کرنے کی جرات نہیں ہوسکتی لیکن تمہارے اشعار نے مجھ میں ایسی حرارت پیدا کردی تھی کہ فوراً تمہارا کلام میری زبان پر آگیا۔ مجھ سے پوچھا گیا یہ کس کا کلام ہے جس میں زندگی کے رمز اور ہنگامے پوشیدہ ہیں۔ تم اس درد اور کیفیت کے ساتھ میرا یہ خاص پیام دریا کاویری تک پہنچادو کیوں کہ دنیا میں وہ زندہ ندی ہے اور تم بھی زندہ ندی کے مانند ہو چناں چہ کیا خوب ہوگا کہ تم دونوں کے نغمے ایک ہو جائیں)۔

ٹیپو سلطان نے پہلے کاویری کی تعریف کی پھر اپنی درد بھری کہانی سُنائی اور بڑے محکم انداز میں زندگی، موت اور شہادت کے فلسفہ کو موثر انداز میں پیش کیا۔ یہ پوری نظم (۴۱) اشعار پر مشتمل ہے جس کے چند اشعار یہاں پیش کئے جارہے ہیں۔

رود کاویری یکی نرمک خرام — خستہ ی شاید کہ از سیر دوام
ای مرا خوش ترز جیحون و فرات — اے دکن را آب تو آب حیات
آہ شہری کو در آغوش تو بود — حسن نوشین جلوہ از نوش تو بود

ای ترا سازی کہ سوز زندگی است　　ہیچ می دانی کہ این پیغام کیست
آنکہ می گردی طواف سطوتش　　بودہ ای آینہ دار دولتش
آنکہ صحرا ھا ز تدبیرش بہشت　　آنکہ نقش خود بہ خون خود نوشت
آنکہ خاکش مرجع صد آرزوست　　اضطراب موج تو از خون اوست
آنکہ گفتارش ہمہ کردار بود　　مشرق اندر خواب او بیدار بود
ای من وتو موجی از رود حیات　　ہر نفس دیگر شود این کائنات
زندگانی انقلاب ہر دمی است　　زانکہ او اندر سراغ عالمی است
درچمن گل مہمان یک نفس　　رنگ و آبش امتحان یک نفس
موسم گل ماتم وہم نای و نوش　　غنچہ در آغوش و نقش گل بدوش
سینہ ای داری اگر در خورد تیر　　در جہان شاہین بزی شاہین بمیر
زندگی را چیست رسم ودین وکیش　　یک دم شیری بہ از صد سال میش
بندہ ی حق ضیغم و آہوست مرگ　　مثل شاہینی کہ افتد بر حمام
گر چہ ہر مرگ است بر مومن شکر　　مرگ پور مرتضی چیزی دیگر
جنگ مومن چیست ہجرت سوی دوست　　ترک عالم اختیار کوی دوست
کس نداند جز شہید این نکتہ را　　او بہ خون خود خرید این نکتہ را

ترجمہ۔ دریائے کاویری جو آہستہ آہستہ مٹک کر چل رہی ہے شاید مسلسل راہ پیمائی کی وجہ سے تھک گئی ہے۔ یہی کاویری مجھے جیحون اور فرات سے عزیز تر ہے اور اس کا پانی دکن کے لئے آب حیات ہے کاویری وہ شہر جو کبھی تیری گود میں پلا تھا آج کہاں ہے جس کے حسن کا مزہ تیرے شیرین مزے میں شامل تھا۔ اے کاویری تو سراپا سوز زندگی ہے تجھے معلوم ہے یہ کس کا پیام ہے۔ یہ اُس کا پیام ہے جس کی شان اور شوکت کا تو طواف کرتی تھی اور جس کی سلطنت کی تو آئینہ دار تھی۔ جس کی تدبیر اور تدبّر سے دشت بہشت تھی جس نے اپنے خون سے اپنی تاریخ لکھی۔ جس کی گفتار اور کردار یعنی قول اور فعل میں

کوئی تفاوت نہ تھا۔ وہ اس وقت بیدار تھا جب سارا مشرق گہری نیند سو رہا تھا۔ میں اور تو اے دریائے کاویری دریائے زندگی کی دو موجیں ہیں۔ یہاں ہر لحہ کائنات دگرگوں ہوتی رہتی ہے کیوں کہ کائنات حقیقت عالم کی سمت سفر کر رہی ہے اس لئے اس کی زندگی میں ہر لحظہ انقلاب نمودار ہوتا ہے۔ چمن میں پھول ایک سانس کا مہمان ہے اس کی خوبصورتی صرف ایک لحظہ کے لئے ہے۔ اگر تیرا سینہ تیر کھانے کی جرات رکھتا ہے تو شاہین کی طرح زندگی کر اور شاہین کی طرح مرجا۔ زندگی کا دین اور مذہب یہی ہے کہ شیر کی طرح ایک لحظہ جینا بھیڑ کے سو سال جینے سے بہتر ہے۔ اللہ کا بندہ، شیر ہے اور اُس کی موت اس کا شکار ہرن۔ چناں چہ موت اس کے سو مقامات میں سے صرف ایک مقام ہے۔ وہ موت پر اس طرح لپکتا ہے جس طرح شاہین کبوتر پر۔ اگر چہ ہر موت مومن کے لئے شکر سے زیادہ شیریں ہوتی ہے لیکن ابن مرتضیٰ کی شہادت کی بات ہی کچھ اور ہے۔ مومن کی جنگ دوست کی سمت ہجرت کا نام ہے۔ یعنی دنیا کو چھوڑ کر کوچہ دوست یعنی خدا کی طرف رخ کرنا ہے۔ اس حقیقت کو صرف شہید جانتا ہے اس لئے وہ اپنا خون دے کر موت اور شہادت کو خریدتا ہے)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال نے ٹیپو سلطان کو جاوید نامہ کا سرنامہ سخن بنا کر زندہ جاوید کیا اور ٹیپو کی شخصیت اور اس کی شہادت کو مسلمانوں کے جگانے کے لئے موثر طریقہ پر استفادہ کیا اسی لئے جب کسی میجر نے ایک فوجی سکول کو علامہ کے نام سے موسوم کرنے کی اجازت چاہی تو علامہ نے لکھا۔ ''ایک معمولی شاعر کے نام سے فوجی سکول کو موسوم کرنا زیادہ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ آپ اس فوجی سکول کا نام ٹیپو فوجی سکول رکھیں۔ ٹیپو ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا''۔

یہی نہیں بلکہ علامہ اقبال ہی کی تحریک اور ترغیب سے ٹیپو سلطان کی سلطنت کے حالات کے مخطوطات اور کتابوں کی طرف توجہ کی گئی اور تاریخ اور ادب میں ایک اچھا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ ضرب کلیم میں علامہ کے اُردو میں پانچ اشعار سلطان ٹیپو کے نام سے نظر آتے ہیں جن پر ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ اور ڈاکٹر راس مسعود

ڈاکٹر سر راس مسعود ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ وہ جسٹس سید محمود کے بیٹے اور سر سید احمد خان کے پوتے تھے۔ ڈاکٹر راس مسعود نے آکسفورڈ یونی ورسٹی میں تعلیم پائی، پٹنہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے اور بعد میں کنگ کالج میں تاریخ کے پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں حیدر آباد دکن میں ناظم تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے پھر ۱۹۳۴ء میں وائس چانسلری سے استعفیٰ دے کر ریاست بھوپال کے وزیر صحت و تعلیم بنے۔ ڈاکٹر راس مسعود کا (۴۸) سال کی عمر میں اچانک انتقال ہو گیا چناں چہ ۳۱ رجولائی ۱۹۳۷ء کو علی گڑھ میں دفنائے گئے۔ اُن کی لوح قبر پر علامہ اقبالؔ کا یہ قطعہ لکھا گیا جس کو اقبالؔ نے اپنی مزار کے لئے محفوظ رکھا تھا۔

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل　　　ز بند این وآن آزادہ رفتم
چو باد صبح گردیدم دمی چند　　　گلاں را رنگ وآب دادہ رفتم

(ترجمہ۔ میں نے اس چمن میں اپنا دل نہیں لگایا بلکہ ہر بندش سے آزاد رہ کر چلا گیا ہوں۔
میں نسیم صبح کی طرح تھوڑی دیر سیر کر کے اور پھولوں کو رنگ و تازگی دے کر چلا گیا ہوں)

اگرچہ علامہ اور راس مسعود کے تعلقات بیسوی صدی کے اوائل سے برقرار تھے لیکن ۱۹۲۷ء سے یہ تعلقات گہرے ہو گئے جب وہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں خطبے دینے گئے تھے اور ڈاکٹر مسعود وہاں ناظم تعلیمات تھے لیکن علامہ کا پہلا خط جو راس مسعود کے نام ہے وہ ستمبر ۱۹۳۳ء کا ہے جو افغانستان کی دعوت کے متعلق ہے۔ علامہ کے خطوط ڈاکٹر مسعود کے نام انگریزی زبان میں ہیں۔ علامہ ۲۴ رجون ۱۹۳۵ء کے خط میں ڈاکٹر راس مسعود کو لکھتے ہیں۔ ''آپ کا خط مل گیا اور اعلیٰ حضرت کا والا نامہ بھی وصول ہو گیا جسے ہم نے سادہ اور خوبصورت فریم میں لگوا دیا ہے زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ آپ کے ملنے کے واسطے تڑپ رہا ہوں''۔

علامہ اقبالؔ ۷ ارنومبر ۱۹۲۹ء سے ۳۰ نومبر تک عبداللہ چغتائی کے ساتھ علی گڑھ میں رہے اور اس دوران چھ مقالات پڑھے۔ پہلے جلسے میں ڈاکٹر راس مسعود نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشین ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمیٔ محفل نہ کر قبول

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبریلؑ نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ "جب میں یورپ میں بیماری کی وجہ بیمارستان میں داخل ہوا تو صرف اقبال کے اشعار مجھے تسکین قلب دیتے تھے"۔ اسی زمانے میں علی گڑھ یونی ورسٹی نے علامہ کو ادبیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔

ستمبر ۱۹۳۳ء میں افغانستان کے حکمران نادر شاہ نے علامہ اقبال، سر راس مسعود اور سلیمان ندوی کو افغانستان کے آموزش اور تعلیمی ادارہ جات کی ترقی اور کابل یونی ورسٹی کے قیام کے تعلق سے مدعو کیا چناں چہ افغانستان کے دورہ میں علامہ اور راس مسعود نے نادر شاہ سے ملاقات کے علاوہ کئی تعلیمی اور آموزشی جلسات میں شرکت کی اور افغانی عہدیداروں کو اپنے نقطہ نظر سے واقف کروایا۔ اس سفر کے دوران علامہ اور ڈاکٹر مسعود نے افغانستان کے وزیر آعظم سردار ہاشم خان، وزیر خارجہ نواز خان اور افغانستان کے مشہور شاعر عبدالہ خان سے ملاقات کی۔ ایک بڑے جلسہ میں علامہ اقبال کے بارے میں ڈاکٹر راس مسعود نے کہا۔ "میرے عزیز دوست اقبال کی شخصیت میں عناصر جدید اور عناصر قدیم کی آمیزش نظر آتی ہے۔ وہ ایک ایسی معجون کے مانند ہے جس کے ذریعے روح کو تقویت اور فکر دانش کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ میں اگر چہ نہ عالم ہوں نہ شاعر لیکن صمیم قلب سے علما اور شعرا کی عظمت کا قائل ہوں"۔ اقبال، مسعود اور سلمان ندوی نے شہر قدیم غزنین میں حکیم سنائی، سلطان محمود، سلطان مسعود، سلطان ابراہیم اور بہلول دانا کی قبروں پر بھی حاضری دی۔ ڈاکٹر راس مسعود نے ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ کی وائس چانسلری سے استعفی دیا اور بھوپال میں وزیر تعلیم و صحت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اُس زمانے میں حمیدیہ بیمارستان بھوپال میں برقی علاج کی مشینیں لگائی گئیں تھیں چناں چہ علامہ ڈاکٹر مسعود کے اصرار پر علاج کی خاطر بھوپال آئے۔ علامہ ۳۱ر جنوری ۱۹۳۵ء کو بھوپال ریلوے اسٹیشن پر پہنچے جہاں اُن کے استقبال کے لئے راس مسعود، ان کے منشی ممنون خان اور بھوپال ریاست کے فوجی عہدیدار جمع تھے۔ ممنون خان بیان کرتے ہیں کہ جب گاڑی اسٹیشن پر رُکی تو اقبال پنجابی قمیص شلوار میں ملبوس افغانی ٹوپی پہنے ہوئے گاڑی سے اُترے تو ڈاکٹر مسعود ان کی طرف دوڑے اور اقبال سے بغلگیر ہو کر اُن کے اس قدر بوسے لئے کہ لوگ حیرت سے دیکھتے رہے۔ ریلوے اسٹیشن سے اقبال

مسعود کے گھر ''ریاض منزل'' پہنچے۔ ممنون خان کہتے ہیں جب میں اقبال کے آرام کرنے کے کمرہ کا جائزہ لینے گیا تو میں نے دیکھا اقبال کے خدمت گزار علی بخش نے علامہ کا بستر جیسے مہمان کے واسطے ڈاکٹر مسعود نے بچھایا تھا اٹھا دیا ہے اور اُس کی جگہ ایک معمولی بستر جو اقبال لاہور سے ساتھ لائے تھے بچھا دیا جس کے ایک کونے پر دو کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ دریافت کرنے پر علی بخش نے بتایا کہ سفر میں اقبال ہمیشہ اپنے بستر پر سوتے ہیں اور وہ ہمیشہ دیوان غالب اور مثنوی مولوی سفر میں ساتھ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود کی بیگم امتہ المسعود اپنے شوہر کی طرح اقبال کی قدرداں تھیں۔ اسی دوران ایک دن اُمتہ المسعود اور علامہ میں شادی اور رشتوں پر بحث ہوئی جس میں یہ مسئلہ اٹھا کہ لڑکے لڑکیوں کی شادی سے پہلے دوستی اور عشق و عاشقی کی کس حد تک اجازت دینی چاہیے۔ کیا والدین اپنے بچوں کے شریک حیات انتخاب کر سکتے ہیں اور یہ رسومات کس حد تک اسلامی ہیں۔ علامہ اقبال نے بتایا کہ شادی کا اصل مقصد نسل کی برقراری اور اولاد صالح، توانا اور زیبا کا وجود ہے چناں چہ عشق اس رشتے میں اچھی چیز ہے لیکن اُس کی دخالت کی زیادہ ضرورت بھی نہیں۔

علامہ اقبال اور ڈاکٹر راس مسعود میں گہرا یارانہ تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر مسعود علامہ سے عمر میں چھوٹے تھے اور اُن کی گہری دوستی زندگی کی آخری دہائی میں ہوئی تھی لیکن اس مختصر مدت کی دوستی نے اُن دراز مدت کی بناوٹی دوستیوں کو پھیکا کر دیا تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ سر راس مسعود اُن گنے چنے افراد میں تھے جو علامہ کو صرف اقبال پکارا کرتے تھے۔ علامہ نے ایک دن مذاق کرتے ہوئے کہا کہ ''مسعود تمھارا دماغ انگریز اور تمہارا دل پکا مسلمان ہے''۔ اُس پر فوراً ڈاکٹر مسعود نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ اُس سے بہتر ہے کہ دماغ مسلمان اور دل انگریز ہو''۔ ڈاکٹر سر راس مسعود بلند قامت، مظبوط بدن اور سفید چہرہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال زندہ رود میں لکھتے ہیں کہ وہ بھوپال کی مسافرت کے دوران ہمیشہ مجھ سے مذاق کرتے تھے۔ بھوپال میں علامہ کے ساتھ جب ایک بار جاوید اقبال بھوپال کی ملکہ کی دعوت پر اُن کے محل گئے تو ملکہ کو دیکھتے ہی اقبال اور راس مسعود سر خم کر کے ایسی تعظیم بجالائے کہ جاوید اپنی ہنسی نہ روک سکے۔

یہ ایک حقیقت تھی کہ علامہ اقبال کی عالمگیر شہرت اور عوام کی جانب سے پذیرائی نے ان کے کئی قدیم دوستوں کو حسد اور نفرت کی آگ میں غرق کر دیا تھا چناں چہ یہ لوگ بظاہر علامہ کے سامنے ان کی تعریف کرتے لیکن ہمیشہ پشت پردہ علامہ کے خلاف پروپیگنڈہ میں مصروف رہتے جس کی علامہ کو اطلاع تھی اور ان افراد کا ذکر خود جاوید اقبال نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔ علامہ نے اکثر ان مسائل کی شکایت اپنے بعض بزرگوں کے خطوط میں اشارے کے طور پر کی ہے۔ ایسے قحط الرجال کے دور میں ڈاکٹر راس مسعود جیسا فرشتہ صفت شخص اقبال کا شیدا تھا اس لئے اقبال راس مسعود سے ملنے کو تڑپتے تھے اور اپنی قلبی کیفیت کو اُن پر ظاہر کرتے۔ حج کی خواہش اور دیارِ محمدؐ کے فراق کا سوز ہمیشہ دل میں ہجوم کئے رہتا چناں چہ جب کبھی مدینہ کا ذکر آتا تو آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ علامہ کی بینائی بہت کمزور ہو چکی تھی چناں چہ آنکھوں کے علاج سے جب بینائی ذرا بہتر ہوئی تو اپریل ۱۹۳۷ء میں راس مسعود کو لکھا انشاءاللہ آئندہ سال حج کے لئے جاؤں گا اور پھر حضورؐ کے دیار کی زیارت سے مشرف ہوں گا اور وہاں سے ایک ایسا ہدیہ اور تحفہ لاؤں گا جو ہمیشہ کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یادگار ہوگا۔ معتبر اسناد سے یہ پتہ چلتا ہے کہ علامہ نے دسمبر ۱۹۳۷ء یعنی مرنے سے چار مہینے قبل ایک مسافرتی کشتی کمپنی سے حج اور زیارت کے لئے خط و کتابت شروع کی تھی لیکن یہ آرزو کبھی پوری نہ ہو سکی۔

ع۔ اے بسا آرزو کہ خاک شود

علامہ اقبال ڈاکٹر راس مسعود کو اپنے دونوں صغیر بچوں جاوید اور منیرہ کا سرپرست اور ولی بنانا چاہتے تھے لیکن بعض وجوہات پر ڈاکٹر راس مسعود اس پر راضی نہ ہوئے۔ کون جانتا تھا کہ ڈاکٹر مسعود خود علامہ سے نو مہینے قبل فوت کر جائیں گے۔ علامہ ۳ر جون ۱۹۳۷ء یعنی ڈاکٹر مسعود کی موت سے دو مہینے قبل لکھتے ہیں۔ ''مجھے یہ فکر ہے کہ میرے صغیر بچوں کی سرپرستی میرے بعد آپ جیسے افراد کے ہاتھوں میں ہو۔ میں خاندانی افراد سے زیادہ آپ پر اعتماد کرتا ہوں خدا آپ کو حضرت نوحؑ کی عمر عطا فرمائے اور یہ بچے اقبال سے زیادہ آپ کو دیکھیں''۔

اس خط کے ایک ہفتہ بعد یعنی ۱۵ر جون ۱۹۳۷ء کو پھر راس مسعود کو لکھتے ہیں۔ ''وصیت نامہ میں

تیسرے نمبر پر بچوں کا سرپرست بھائی کا لڑکا شیخ اعجاز احمد ہے جو بہت صالح اور اچھا آدمی ہے لیکن متاسفانہ وہ قادیانی مسلک کا پابند ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ شخص جس کا عقیدہ ایسا ہو کس طرح سے مسلمان بچوں کا سرپرست ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ لاہور کے باہر زندگی کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں اُس کی جگہ آپ کا نام رکھ دوں۔ مجھے امید ہے کہ اس بابت آپ کو اعتراض نہ ہوگا"۔

علامہ اقبال کی صحت خراب اور مالی طاقت کم اور اخراجات زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ مالی بحران سے دوچار اور پریشان تھے۔ جب جاوید کی والدہ سردار بیگم کا انتقال ہو گیا تو علامہ نے ۱۲ر مئی ۱۹۳۵ء میں راس مسعود کو لکھا۔ "میری یہ خواہش ہے کہ اعلیٰ حضرت بھوپال مجھے تاحیات وظیفہ دیں تاکہ میں اطمینان کے ساتھ قرآن مجید کے متعلق ایسی کتاب لکھوں جس کی نظیر نہ مل سکے اور وہ کتاب مجھے زندہ جاوید رکھے۔ ایسی کتاب اسلام کی بڑی خدمت تصور کی جائے گی۔ جب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس زمانے میں دنیائے اسلام میں صرف میں وہ تنہا شخص ہوں جو اس کام کو انجام دے سکتا ہوں تو میں خود ستائی نہیں کر رہا ہوں"۔ سر راس مسعود کی کوششوں سے والیٔ بھوپال نے علامہ کو ہر مہینے پانچ سو روپے کا وظیفہ تاحیات مقرر کیا جس کا شکریہ علامہ نے تحریر اور اشعار کے ذریعہ ادا کیا۔

اس مالی مدد سے ڈاکٹر راس مسعود مطمئن نہ ہوئے اور وہ دوسری ریاستوں جن میں حیدرآباد دکن اور بہاول پور شامل تھے علامہ کے لئے وظائف حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن علامہ نے ان کو منع کیا اور ۱۱ر ستمبر ۱۹۳۵ء کے خط میں لکھا۔ "جو مالی مدد اعلیٰ حضرت بھوپال نے کی ہے وہ میرے لئے کافی ہے میں امیرانہ زندگی کی عادت نہیں رکھتا کیوں کی اچھے مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی گزاری ہے ضروریات زندگی سے زیادہ کی حوس حرص اور لالچ ہوتی ہے جو مسلمان کی شایان شان نہیں۔ پھر اس خط کو پڑھنے کے بعد آپ کو اس لئے تعجب ہوگا کہ آپ جن بزرگوں کی اولاد ہیں انھوں نے ہمیشہ قناعت اور سادگی میں زندگی بسر کی ہے"۔

علامہ ۲۹ر جون ۱۹۳۶ء کو ڈاکٹر راس مسعود کو لکھتے ہیں کہ "تیسری اپریل کی رات جب شیش محل بھوپال میں سو رہا تھا میں نے خواب میں آپ کے دادا سر سید احمد خان کو دیکھا تو انھوں نے کہا اپنی

بیماری کی حضور رسالت مآب سے شفا طلب کرو، چناں چہ اُسی حالت میں بیدار ہو کر چند اشعار نظم کیے تھے اور لاہور پہنچ کر ان اشعار کو تکمیل کیا جو فارسی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' کا حصہ ہوں گے۔

اس مثنوی کا عنوان "در حضور رسالت مآب" ہے جو (۶۲) اشعار پر مشتمل ہے جس کے ایک شعر پر ہم اس مضمون کو تمام کرتے ہیں۔

؎ با پرستاران شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز

(ترجمہ۔ میں تاریکی پھیلانے والوں سے لڑ رہا ہوں، کچھ اور تیل میرے چراغ میں ڈال دے)

سپاس جناب امیرؑ

علامہ اقبالؔ کا وظیفہ

مدیر مخزن بیرسٹر عبدالقادر نے مخزن ۱۹۰۵ء میں علامہ اقبالؔ کی یہ چونتیس (۳۴) شعر کی نظم ''سپاس جناب امیرؑ'' کو اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ ''ذیل کی نظم درج کر کے آج ہم اُن احباب کے تقاضوں سے سبکدوش ہوتے ہیں جو پروفیسر اقبالؔ صاحب کے فارسی کلام کے لئے اکثر دفعہ بے حد اشتیاق ظاہر کیا کرتے ہیں۔ فارسی نظمیں عموماً مخزن میں درج نہیں ہوتیں تاہم احباب کے اصرار پر ہم اِسے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم با اظہار عقیدت شیخ صاحب صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں''۔ اس نظم کو مرحوم تصدق حسینؒ تاج نے ۱۹۳۸ء میں احمدیہ پریس چار مینار سے شائع کیا جس کی ایک کاپی ان کے فرزند جناب احمد حسین نے راقم کو عنائیت کی ہے۔ یہ نظم ۱۹۵۷ء جنوری کے رضا کار لاہور میں بھی شائع کی گئی۔ اِسی نظم کے تیرہ (۱۳) اشعار علامہ نے عشق کے عنوان پر اپنے فارسی کلام میں شائع کئے اور پوری نظم باقیات اقبالؔ میں موجود ہے۔ علامہ اقبالؔ نے کبھی بھی عوام کے سامنے اپنے آپ کو مذہبی، متقی اور پرہیزگار ظاہر کرنے کی کوشش نہ کی۔ اگر قرآن کی تلاوت، نماز کی پابندی یا نماز تہجد کا ذکر کیا تو وہ بھی ایک غیر مسلم دوست مہاراجہ کشن پرشادؔ کے خصوصی خطوط میں۔ علامہ کی مذہبی زندگی اور ان کے عبادات کے حالات ہمیں ان کے خادم علی بخش، ان کے قریبی رشتے دار اور بے تکلف دوستوں کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں علامہ عبادت میں خلوت پسند تھے شاید اسی لئے اس دورنی قلبی وارادات کو اپنے مجموعہ کلام کا جزو نہیں بنایا۔ کیوں کہ اس سے ان کے جذبات اور دلی کیفیات کا دریا اُبلتا نظر آتا ہے۔

اس نظم کے ۳۴ اشعار ترجمے کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اے محو ثنائے تو زبان ہا اے یوسفؑ کاروان جان ہا

(زبانیں آپ کی تعریف میں مصروف ہیں۔ آپ جانوں کے قافلے کے یوسفؑ یعنی سردار اور پیشوا ہیں)۔

۲ اے باب مدینہ محبت اے نوح سفینہ محبت

(آپ (علیؑ) شہر محبت کے دروازے اور محبت کی کشتی کے نوحؑ ہیں)

اس شعر میں دو معروف حدیثوں کی طرف اشارہ ہے۔

۳ اے ماحی نقش باطل من اے فاتح خیبر دل من

(آپ میرے باطل افکار کو مٹانے والے یعنی صحیح راہ دکھانے والے ہیں اور آپ میرے دل کے قلعہ خیبر کو فتح کرنے والے ہیں تا کہ میرے دل میں کفری امنگوں کا خاتمہ ہو جائے)۔

۴ اے سرّ خط وجوب وامکاں تفسیر تو سور ہائے قرآں

(آپ واجب الوجود (خدا) اور ممکن الوجود (بندے) کے درمیان رشتہ قائم کرنے والے خط مستقیم ہیں۔ قرآن کے سوروں میں آپ کی تعریف موجود ہے)۔

۵ اے مذہب عشق را نمازی اے سینۂ تو امین رازی

آپ عشق کے مذہب کی نماز ہیں اور آپ کے سینے میں راز الٰہی چھپا ہوا ہے)۔

۶ اے سرّ نبوت محمدؐ اے وصف تو مدحت محمدؐ

(آپ نبوت محمدؐ کے رازداں ہیں آپ کی تعریف یعنی محمدؐ کی تعریف ہے)۔

۷ گردوں کہ بہ رفعت استادہ است از بام بلند تو فتادہ است

(آسمان جو بلندی پر قائم ہے آپ کے بام کی بلندی سے نیچے ہے یعنی آپ کا مقام آسمانوں سے بلند و بالا ہے)۔

۸ ہر ذرہ در گہت چو منصور در جوش ترانۂ انا الطور

(آپ کی درگاہ کا ہر ذرہ جوش میں آ کر میں کوہ طور ہوں نغمہ سرائی کرتا ہے)۔

۹ بے تو نتواں بہ او رسیدن بے او نتوان بتور رسیدن

(اے علیؑ آپ کی معرفت بغیر کوئی خدا تک نہیں پہنچ سکتا اور خدا کے کلام کے سمجھے بغیر کوئی آپ تک نہیں پہنچ سکتا)۔

۱۰ فردوس ز تو چمن در آغوش　　از شان تو حیرت آئینہ پوش

(آپ کی وجہ سے جنت پُر بہار ہے اور آپ کی شان دیکھ کر خود حیرت دنگ ہے)۔

۱۱ جانم بہ غلامی تو خوش تر　　سر بر زدہ ام ز حبیب قنبر

(مجھے آپ کی غلامی پسند ہے مجھے آپ کے غلام قنبر کی نسبت حاصل ہو جائے)

۱۲ ہشیارم و مست بادۂ تو　　چوں سایہ ز پا فتادۂ تو

(میں آپ کی محبت میں سرشار اور ہوشیار ہوں اور آپ کے قدموں پر سایے کے مانند پڑا ہوں)۔

۱۳ از ہوش شدم مگر بہ ہوشم　　گوئی کہ نصیرئی خموشم

(میں ہوش کھو کر بھی ہوش وحواس میں ہوں یعنی ایک نصیری کی طرح خاموش زندگی بسر کر رہا ہوں)۔

۱۴ دانم کہ ادب بہ ضبط راز است　　در پردۂ خامشی نیاز است

(مجھے علم ہے کہ عشق کے راز کو چھپانا چاہیے اور نیاز محبت کو خاموشی کے پردوں میں رکھنا چاہیے)۔

۱۵ لیکن چہ کنم مئے تولا　　تند است بروں فتد زمینا

(مگر کیا کروں آپ کی محبت کی شراب ایسی تیز ہے کہ دل کی بوتل سے ہونٹوں پر ابل پڑتی ہے)۔

۱۶ زاندیشۂ عاقبت رہیدم　　جنس غم آلِ تو خریدم

(مجھے اپنی عاقبت کا خیال ہے اسی لئے تری اولاد کا غم مول لیا ہوں)۔

۱۷ فکرم چو بہ جستجو قدم زد　　در دیر شد و در حرم زد

(میرے فکر نے جب جستجو شروع کی تو کبھی مندر اور کبھی کعبہ کے دروازے کھٹکھٹائے)۔

۱۸ در دشت طلب بسی دویدم　　داماں چو گرد باد چیدم

(میں دشت طلب میں بگولے کی طرح سرگرداں رہ کر کہساروں کے دامنوں سے چیزیں جمع کیا ہوں)۔

۱۹ در آبلہ خار ہا خلیدہ　　صد لالہ ز قدم دمیدہ

(تب جا کر میرے پاؤں میں چھالے اور ان میں کانٹے ٹوٹے اور قدموں کے نیچے اتنا خون بہا کہ سینکڑوں لالہ ظاہر ہوئے)۔

۲۰ افتادہ گرہ بروے کارم شرمندۂ دامن غبارم

(میرے کاموں میں رکاوٹیں آئیں اور میں سرتاپا گردوغبار میں بھر گیا)۔

۲۱ پویاں پئے خضر سوئے منزل بردوش خیال بستہ محمل

(میں خیال کے کاندھوں پر اپنا محمل سفر باندھ کر خضر (رہنما) کے پیچھے منزل کی طرف چلتا رہا)۔

۲۲ جویاے مئے و شکستہ جامی چون صبح بہ یاد چیدہ دامی

(میں مئے ولا کا خواستگار لیکن میرا جام ٹوٹا ہوا تھا اُسی طرح سے کی صبح جو نسیم سحر سے محروم ہو)۔

۲۳ پیچیدہ بہ خود چو موج دریا آوارہ چو گرد باد صحرا

(میں دریا کی موجوں کی طرح پیچ و تاب کھاتا اور صحرا کے بگولوں کی طرح آوارہ پھرتا تھا)۔

۲۴ واماندہ زدرد نارسیدن در آبلۂ شکستہ دامن

(پیروں کے چھالوں کے درد سے منزل تک پہنچنا ناممکن نہ تھا)۔

۲۵ عشق تو دلم ربود ناگاہ ازکار گرہ کشود ناگاہ

(آپ کی محبت نے دل کو تھاما اور جو میرے کام میں گرہ پڑ گئی تھی اس کو کھول دیا)۔

۲۶ آگاہ زہستی وعدم ساخت بت خانہ عقل را حرم ساخت

(مجھے ہستی اور نیستی کے رازوں سے آگاہ کیا اور عقل کے بت خانہ کو کعبہ بنا دیا)۔

۲۷ چوں برق بجز منم گزر کرد از لذت سوختن خبر کرد

وہ برق کی طرح مجھ میں گزری اور عشق میں جلنے کی لذت سے آشنا کر گئی)

۲۸ برباد متاع ہستم داد جامے زمئے حقیقت ام داد

(جس نے میرے ہستیٔ مجاز کو برباد کر کے مجھے حقیقت سے بھرا ہوا ساغر عطا کیا)۔

۲۹ سرمست شدم زپا فتادم چوں عکس زخود جدا فتادم

(میں اس قدر مست ہوا کہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکا اور اپنی ذات سے جدا ہو کر رہ گیا)۔

۳۰ پیراہن ماومن دریدم چوں اشک زچشم خود چکیدم

(میں نے خودی کا لباس پھاڑ ڈالا اور آنسو کی طرح اپنی ذات سے ٹپک گیا)۔

۳۱ خاکم بہ فراز عرش بردی زاں راز کہ بادلم سپردی

(آپ نے مجھے رازوں سے آگاہ کر کے میری منزلت کو عرش تک پہنچا دیا)۔

۳۲ واصل بہ کنار کشتی ام شد طوفان جمال زشیتم شد

(میری کشتی کنارے سے لگ گئی اور طوفانی موجوں سے میرے بدصورتیاں حسین ہو گئیں)۔

۳۳ جز عشق حکایتی ندارم پروائے ملامتی دارم

(عشق کے قصہ کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا۔ لوگوں کی طعن کی بھی پروا نہیں کرتا)۔

۳۴ از جلوۂ عام بے نیازم سوزم گریم تپم گدازم

(میں حسن کے جلوے عام سے بے نیاز ہوں کیوں کہ میں نے تیرا صحیح عشق حاصل کر لیا ہے جس میں خود جلتا ہوں، روتا ہوں، تڑپتا ہوں اور گھلتا ہوں)۔

علامہ اقبال اور مسئلہ فلسطین

علامہ اقبال کی مسئلہ فلسطین سے گہری وابستگی پہلی جنگ عظیم سے نظر آتی ہے۔ فلسطین کا مسئلہ تمام عمر اُن کی شاعری اور گفتگو کا موضوع بھی رہا۔ اس مسئلہ پر پہلی مستند تحریر علامہ کے خط مورخہ ۲۹ فبروری ۱۹۲۲ء میں نظر آتی ہے جس میں مولانا گرامی کو لکھتے ہیں۔ ''ترکوں کے ساتھ اتحادیوں کا جو عہد نامہ ہوا تھا اس کی رُو سے مقامات مقدسہ فلسطین و شام کے لئے ایک کمیشن مقرر ہونے والی ہے۔ جس کے ممبر مسلمان، عیسائی و یہود ہوں گے۔ گورنمنٹ نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ آیا میں اس کمیشن کا ممبر بننا قبول کر سکتا ہوں۔ اس کمیشن کے اجلاس مقام یروشلم میں ہوں گے اور دو تین سال میں معتدد بار یہاں سے یروشلم جانا پڑے گا۔ بعد کامل غور آج میں نے فیصلہ کر دیا ہے کی میں اس میں شریک نہیں ہو سکتا''۔ علامہ نے جس کمیشن کا ذکر کیا اُس کے بارے میں '' سروے آف انٹرنیشنل افیرز '' (Survey of International Affairs) ۱۹۲۵ء میں تحریر ہے کہ ''دفعات انتداب کے مطابق فلسطین کے مقامات مقدسہ کے سلسلے میں جو مسیحوں، مسلمانوں اور یہودیوں کے نزدیک یکساں مقدس ہیں پوری ذمہ داری انتدابی مملکت نے سنبھال لی ہے اور وہ اس معاملے میں صرف جمیعت اقوام کے روبرو جواب دہ ہوگی۔ ایک کمیشن اس غرض سے مقرر کیا جائے کہ وہ مقامات مقدسہ کے متعلق فلسطین کی تمام مذہبی ملتوں کے حقوق و دعاوی کا مطالعہ کرے، ان کی حد بندی اور تعین کر دے۔ یہ کمیشن انتدابی مملکت مقرر کر دے گی۔ کمیشن کے ارکان کی نامزدگی کا طریقہ، کمیشن کی ہیئت ترکیبی اور اس کے وظایف جمیعت اقوام کی کونسل سے منظور کرائے جائیں گے''۔

اس کمیشن میں شریک نہ ہونے کی وجہ بتاتے ہوئے ۲۲ فبروری ۱۹۲۲ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں۔ ''یہ رائل کمیشن ہوگی اور رائل کمیشن کے ممبروں کے قاعدے کی رو سے سوائے اخراجات سفر کے اور کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ چون کہ میں دولت مند آدمی نہیں اور یہ کام قریباً دو سال جاری رہے گا اور اجلاس کے لئے ہر سال فلسطین جانا پڑے گا اس واسطے مجبوراً بادلِ ناخواستہ مجھے انکار کرنا پڑا''۔ بہر حال علامہ نے حکومت برطانیہ کو اپنے نفی کے جواب سے مطلع کیا مگر بعد میں حالات کچھ

ایسے بدلے کہ یہ کمیشن بن ہی نہ سکا۔

حکومت برطانیہ کے سابق وزیر اعظم لارڈ بالفور (Lord Balfour) نے نومبر ۱۹۱۷ء میں ایک اعلان شائع کیا تھا جس میں یہودیوں کو یہ اطمینان دلایا گیا تھا کہ سرزمین فلسطین کو ان کا صیہونی ملک بنایا جائے گا۔ چنانچہ اس اطلاعیہ کے بعد دنیا بھر کے یہودی جوق در جوق فلسطین میں وارد ہوئے اور اُنھوں نے مسجد اقصیٰ کے ایک حصّہ پر قبضہ حاصل کیا جس کی وجہ سے عرب اور یہودیوں کے تعلقات بہت خراب ہو گئے اور حکومت برطانیہ کی مدد اور بے پناہ طرفداری سے ہزاروں فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا۔ انہی تشویش ناک حالت اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کے اعتراض میں ۷ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو ایک بڑا جلسہ لاہور کے دہلی دروازے کے قریب منایا گیا جس میں علامہ اقبالؔ نے فرمایا۔

''فلسطین میں مسلمانوں ان کے بچوں اور عورتوں کو شہید کیا جا رہا ہے اور یہ قتل و غارت مسجد اقصیٰ کے پاس کیا جا رہا ہے جو مقام معراج رسولؐ خدا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے یہودیوں کو فلسطین پر کوئی قانونی یا تاریخی حق حاصل نہیں''۔

۱۹۱۴ء میں انگریزوں نے اپنی سیاسی فائدہ کی خاطر یہودیوں کو آلۂ دست بنایا چناں چہ یہودیوں نے یہ ادّعا کیا ہے کہ مسجد اقصیٰ کا ایک حصّہ اُن سے متعلق ہے اسی لئے اس کو حاصل کرنے کے لئے فتنہ و فساد برپا کیا اور مسلمانوں کو ان کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ بھیڑیوں کی طرح ذبح کیا ہے۔ اسی لئے مجلس عالی فلسطین نے یہ اعلان کیا ہے کہ یہودیوں کی یہ حرکتیں مسلمانوں کے لئے بہت بُرے نتائج کی حامل ثابت ہونگیں۔ اقبالؔ مغربی سیاسیات پر یہودیوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو سمجھ گئے تھے اُن کا خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن یورپ ان کے دامِ فریب کا شکار ہو کر رہے گا۔

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار	جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح	دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

علامہ اپنی دوسری نظم 'یورپ اور یہود' میں اسی خیال کی عکاسی فرماتے ہیں۔

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ	شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی

فلسطین کے مفتی اعظم سید امین الحسینی نے اتحاد عالم اسلام اور فلسطین کے مسائل پر غور کرنے کے لئے دسمبر ۱۹۳۱ء میں بیت المقدس میں ایک موتمر بلائی اور علامہ اقبال کو بھی مدعو کیا۔ اس کانفرس میں مولانا شوکت علی کے علاوہ عراق سے کاشف الغطا مجتہد العصر نجف اشرف مصر سے محمد علی علویہ اور ایران سے سید ضیا الدین طباطبائی قابل ذکر تھے۔

جاوید اقبال زندہ رود میں لکھتے ہیں کی ۶/ڈسمبر ۱۹۳۱ء صبح ساڑھے نو بجے اقبال بیت المقدس پہنچے۔ بارش شدید ہونے کے باوجود اسٹیشن پر مفتی اعظم سید امین حسینی اور دوسرے کارکنان کانفرس خیر مقدم کے لئے موجود تھے۔ اس کانفرس میں مفتی اعظم کو صدر، محمد علی پاشا، علامہ اقبال اور ضیا الدین طباطبائی کو نائب صدر انتخاب کیا گیا۔ علامہ اقبال ۷/ڈسمبر سے ۱۴ڈسمبر تک مختلف جلسوں اور تشکیلاتی کمیٹوں میں شامل ہوئے اور آپنے گراں قدر خیالات سے اتحاد بین المسلمین اور مسئلہ فلسطین کو سنوارتے رہے۔ علامہ نے حجاز کی ریلوے لائین کے بارے میں کہا کہ یہ ریلوے لائین مسلمانوں سے متعلق ہے اور اُسے غیر اسلامی ملکیت سے خارج کیا جائے۔ فلسطین کے مقامات مقدسہ کے بارے میں اقبال نے مسلمانان عالم کو مشورہ دیا کہ وہ یہودیوں کا مالی بائیکاٹ کریں اور یہودیوں کو فلسطین میں داخل ہونے اور صیہونی حکومت بنانے سے روکیں اس کے علاوہ وہ "دیوار گریہ" پر یہودیوں کے حق کے بھی مخالف تھے۔ علامہ اقبال نے ۱۴/ڈسمبر ۱۹۳۱ء کو عصر کے وقت انگریزی میں وداعی خطبے میں کہا کہ "مجھے سخت افسوس ہے کہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے کانفرس کے اختتام تک نہیں رہ سکتا لیکن میری یہ آرزو ہے کہ اس سرزمین انبیاء اور مقامات مقدسہ کی دوبارہ زیارت کروں۔ آج کل اسلام کو دو بڑے خطرے گھیرے ہوئے ہیں۔ ایک کمیونزم اور دوسرے وطن اور قوم پرستی۔ یہ ہمارا وظیفہ ہے کہ ہم ان دونوں گمراہ طاقتوں کا مقابلہ کریں۔ میں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ ہم دل سے مسلمان ہوں۔ میں اسلام کے دشمنوں سے نہیں بلکہ خود مسلمانوں سے خوف زدہ ہوں"۔ ایرانی وفد کے سربراہ آقا ضیاء الدین طباطبائی لکھتے ہیں کہ "میں علامہ کی تقریر کا عربی میں ترجمہ کر رہا تھا لیکن جب علامہ نے فی البدیہہ تین فارسی کے اشعار پڑھے تو سامعین پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا اور یہ آبدار اشعار دل میں ایسے پیوست

ہوئے کہ ان کا ترجمہ میرے لئے جو خود فارسی زبان تھا مشکل ہو گیا''۔ علامہ نے جو فارسی کے اشعار پڑھے وہ یہ تھے۔

طارق چو بر کنارہ ی اندلس سفینہ سوخت　　گفتند: کار تو بہ نگاہ خرد خطاست
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم　　ترک شعیب ز رو شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر بردو گفت　　ہر مُلک مُلک ماست کہ مِلک خدائے ماست

ترجمہ۔ طارق نے جب اندلس کے کنارے پر اپنی کشتیاں جلا ڈالیں تو لوگوں نے کہا کہ عقل کی نظر سے یہ کام غلط تھا۔ ہم وطن سے دور ہیں اور شریعت میں گھر کو چھوڑنا جائیز بھی نہیں۔ طارق مسکرایا اور شمشیر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ دنیا کا ہر ملک ہمارا ہی ملک ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا کی ملکیت ہے)۔

علامہ اقبالؔ نے اپنی اقامت کے دوران فلسطین میں مقامات مقدسہ کی زیارت کے علاوہ فلسطین کے یتیم خانہ، حضرت عیسیٰؑ کے محل ولادت اور فلسطین کے اکابروں اور نوجوانوں سے ملاقاتیں کیں۔ علامہ نے فلسطینی نوجوانوں کو باعزم اور انقلابی دیکھ کر انھیں سراہا چناں چہ اسی جوش و خروش کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ نے انھیں نصیحت کی کہ مغربی اقوام سے کسی قسم کے انصاف کی توقع رکھنا عبث ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خدا و خودی کو رہنما بنا کر کھوئے ہوئے فلسطین کو دوبارہ حاصل کیا جائے۔

تری دوا نہ جینوا میں ہے نہ لندن میں　　فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود میں ہے
سُنا ہے میں نے غلامی سے اُمتوں کی نجات　　خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

فلسطین کانفرس کے وداعی خطبے میں اقبالؔ نے بڑی تاکید کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل عرب کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے اور عرب کا مستقبل اتحاد پر موقوف ہے جب عرب متحد ہو جائیں گے تو اسلام بھی کامیاب ہو جائے گا۔ ہم سب پر واجب ہے کہ اس باب میں ساری قوتیں صرف کر دیں''۔ مسئلہ فلسطین پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ نے مس فارتو ہرسن کو لکھا۔

''فلسطین پر یہودیوں کا بھی کوئی حق نہیں۔ یہودیوں نے تو اس ملک کو رضامندانہ طور پر عربوں کے فلسطین پر قبضہ سے بہت پہلے خیرباد کہہ دیا تھا۔ صیہونیت بھی کوئی مذہبی تحریک نہیں۔ علاوہ اس امر کے

مذہبی یہودیوں کو صیہونیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ خود فلسطین رپورٹ نے اس امر کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے"۔ علامہ جانتے تھے کہ حکومت برطانیہ فلسطین پر یہودیوں کا حق ثابت کرنے کے لئے یہ پروپگنڈہ کر رہے ہیں کہ عربوں نے یہودیوں کو فلسطین سے نکالا تھا اس لئے یہ سرزمین اُن کو واپسی دلانا مناسب ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اس خیال کو غلط ثابت کر کے یہ سوال اٹھایا کہ اگر فلسطین پر یہودیوں کا حق ہے تو عربوں کا حق اسپین اور سسلی اور دوسرے یورپین مفتوحہ علاقوں پر کیوں نہیں ہو سکتا ہے۔ یہودیوں کا دعویٰ ایسا ہی ہے، جیسے ریڈ انڈین امریکہ پر اور ہُن گاتھ اور گال قومیں برطانیہ پر دعویٰ کر دیں۔ ہزار سال دستر برداری اور خاموشی کے بعد یہودیوں کا نیا دعویٰ بالکل بے دلیل ہے اور اس کے پیچھے مغرب کا ہاتھ ہے۔

ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا
مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد و رطب کا

اقبالؔ اپنی تمام زندگی فلسطین عوام کے ساتھ جہاد بالقلم میں مصروف رہے۔ جب ۱۹۳۳ء میں حکومت برطانیہ نے فلسطین میں ایک حکومت ملّی یہودیوں کے زیر نگرانی بنانے کا اعلان کیا تو اُسی سال ۶ نومبر کو اقبالؔ نے حکومت برطانیہ کے وزیر اعظم کو ٹیلیگراف بھیجا کہ "فلسطین کے حالات سے ہندوستانی مسلمان میں تشویش اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے چونکہ برطانیہ کی سیاست یہ ہے کہ عربوں کے فائدے کے خلاف فلسطین میں یہودیوں کی حکومت برقرار کرے یہ سیاسی دشمنی جو مسلمانوں کے ساتھ کی جا رہی ہے فوراً ختم کی جائے اور بالفور کے اجنڈے کو واپس لے لیا جائے تا کہ مسلمانوں اور حکومت برطانیہ کے تعلقات اس سے بدتر نہ ہوں"۔ علامہ نے اس طرح کا ایک ٹیلگرام حکومت برطانیہ کی پارلمنٹ کو بھی بھیجا۔ جب جولائی ۱۹۳۷ء میں حکومت برطانیہ نے فلسطین کی تقسیم کا اعلانیہ منتشرہ کیا تو علامہ بہت رنجیدہ اور مضطرب ہوئے چنان چہ مسلم لیگ سے خواہش کی کہ فوراً لاہور میں جلسہ عمومی تشکیل دیا جائے چناں چہ ۱۲ جولائی ۱۹۳۷ء موچی دروازے کے باغ میں جناب ملک برکت علی کی صدارت میں ایک عظیم جلسہ منایا گیا اور علامہ اقبالؔ کا خطبہ پڑھا گیا جو اُن کے مرنے

سے نو مہینے قبل کی یادگار ہے۔ علامہ نے کہا ''عربوں کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے وہ ہر مسلمان کے لئے باعث اضطراب اور رنج ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانان جہان کو ایک موقع فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے وہ اس امر کا پوری قدرت سے اعلان کریں کہ مسئلہ فلسطین جسے برطانوی حکومت یہودیوں کے حق میں حل کرنا چاہتی ہے وہ محض مسئلہ فلسطین نہیں بلکہ اسلامی مسئلہ ہے جس کا شدید اثر تمام تر دنیائے اسلام پر ہوگا۔ فلسطین سے یہودیوں کا جبری اخراج کبھی بھی نہیں ہوا بلکہ بقول یہودی محقق پروفیسر ہوکنگ ''یہود اپنی مرضی سے اس ملک فلسطین سے باہر نکل گئے اور ان کے مقدس صحائف کا غالب حصہ فلسطین سے باہر ہی مرتب و مدون ہوا''۔ علامہ نے یہ بتایا کہ یورپ پہلے کمزور ممالک کو ظلم و ناانصافی کا نشانہ بناتا ہے اور پھر اس کے غم میں مگرمچھ کے آنسو بہا کر ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ علامہ نے فرمایا ''فلسطین میں یہود کے لئے ایک قومی وطن کا قیام تو محض حیلہ ہے حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ میں مستقل انتداب اور سیادت کی شکل میں اپنے لئے ایک مقام کی تلاش میں ہے''۔

چنانچہ علامہ نے یورپ اور خصوصی طور پر برطانیہ کی اس سازش پر اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے — ہر ملت مظلوم کا یورپ ہے خریدار
جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل — تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکان جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر — بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

علامہ اقبال نے قائداعظم محمد علی جناح کو لکھا کہ "۱۵/اکتوبر ۱۹۳۷ء کو لکھنو میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ میں فلسطین کی حمایت میں قرارداد منظور کی جائے اسی خط میں لکھتے ہیں مسئلہ فلسطین مسلمانوں کے ذہن کو بہت متاثر کر رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس جلسہ میں نہ صرف ایک قرارداد پاس کی جائے بلکہ مسئلہ فلسطین پر ایک عظیم کانفرس برصغیر میں منعقد کریں تاکہ مسلمانان ہند سے فلسطین کے مسئلہ کو فائدہ پہنچے۔ ذاتی طور پر میں ایسے مقصد کے لئے جیل جانے کے لئے بھی تیار ہوں۔

مشرق کے دروازے پر ایک مغربی مرکز بہت خطرناک ہے''۔

علامہ اقبال نے فلسطین کے سفر کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا ''سفر فلسطین میرے زندگی کا

دلچسپ واقعہ ثابت ہوا۔ فلسطین کے زمانہ قیام میں متعدد اسلامی ممالک مثلاً مراکش، مصر، یمن، شام، عراق اور جاوا کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی۔ شام کے نوجوانوں سے مل کر خاص طور پر متاثر ہوا"۔

علامہ ہی کی دعوت اور ان کے اصرار پر مفتی اعظم فلسطین سید حسینی ہندوستان آئے چنانچہ عطیہ فیضی کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قیام بمبئی میں بوہیر پیشوا سیدنا سیف الدین کے پاس رہا اور اس سفر جو مئی ۱۹۳۳ء میں ہوا علامہ نے مفتی اعظم کی مالی عنایت بھی کی۔

علامہ کے انتقال کے (۳۶) سال بعد مفتی فلسطین پاکستان آئے اور علامہ اقبال کی قدردانی کی اور ان کے جذبات کو فلسطینی تنظیم کی روح قرار دیا۔

مولانا گرامی اور علامہ اقبال

مولانا غلام قادر گرامی ۱۸۵۶ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۷ء کو ہوشیار پور کے قبرستان کندن شاہ بخاری میں دفن ہوئے۔ غلام قادر گرامی فارسی کے بڑے عالم اور مشہور شاعر تھے۔ مولانا گرامی علامہ اقبال کے خاص دوستوں میں تھے۔ واقعات اور مراسلات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ گرامی اور اقبال کے تعلقات ۱۹۰۲ء سے گرامی کی رحلت ۱۹۲۷ء تک برقرار رہے۔ علامہ کی گرامی سے ملاقات انجمن حمایت اسلام کے جلسات سے شروع ہوئی اگرچہ علامہ کا پہلا خط گرامی کے نام ۱۱ر مارچ ۱۹۱۵ء اور آخری خط ۳۱ر جنوری ۱۹۲۷ء کا ہے۔ علامہ اقبال کے تقریباً (۹۰) خطوط گرامی کے نام ہیں۔ جن سے بے تکلفی، شوخی، مسائل خانگی، مقدمات دیوانی، بیماری اور نجی گفتگو کے ساتھ ساتھ فلسفہ، تصوف، فارسی شاعری پر بحث و مباحثہ کے علاوہ اقبال کی شاعری پر گرامی کی تنقید، تفسیر اور تعریف کے حوالوں کا پتہ ملتا ہے۔ غلام قادر گرامی محلہ کی مسجد میں قرآن پڑھنے کے بعد خلیفہ ابراہیم کے مکتب میں شریک ہوئے جہاں فارسی کے متداول درسی کتابیں، بوستان، گلستان اور سکندر نامہ پڑھیں۔ استطاعت شعری دیکھ کر خلیفہ ابراہیم نے ان کی ہمت افزائی کی چناں چہ بقول خود ابھی میری عمر آٹھ سال سے زیادہ نہ تھی کہ خلیفہ ابراہیم نے مجھے ملک الشعراء کے خطاب سے مخاطب کیا چناں چہ ابتدائی دور مشق میں مجھے انتہائی مقام کا عنوان حاصل ہو گیا۔ گرامی مکتب کی تعلیم حاصل کر کے لاہور آئے اور اورینٹل کالج لاہور میں فارسی ادبیات میں منشی عالم اور منشی فاضل پاس کیا پھر وکالت کا امتحان پاس کیا لیکن کبھی وکالت نہیں کی بلکہ تدریس اور معلمی کو اپنا پیشہ بنایا چناں چہ امرتسر، کپورتھلہ اور لدھیانہ میں فارسی مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر محکمہ پولیس میں سارجنٹ رہے اور جلد ہی اس سے فراغت حاصل کی اور چار سال تک نواب فتح علی خان قزلباش کے اتالیق رہے۔ پھر گرامی کے دل میں دکن جانے کی خواہش پیدا ہوئی چناں چہ میجر حسن بلگرامی کی وساطت اور مولانا محمد حسین آزاد کی سفارش سے حیدرآباد پہنچے اور حضور نظام نواب محبوب علی خان کی شان میں قصیدہ ''گرامی بہ حضور آید'' پیش کر کے ''شاعر خاص'' دربار مقرر ہوئے۔ محمد حسین آزاد نے اپنے خط میں گرامی کو اوّل درجہ کا شاعر کہا تھا اور

جلال اسیر، قاسم مشہدی اور ظہوری کی طرز کا شاعر نامزد کیا تھا۔ مولانا گرامی ۱۸۸۹ء سے ۱۹۱۷ء یعنی (۲۸) سال حیدرآباد میں مقیم رہے اور انھیں وہاں ملک الشعرا کا خطاب بھی دیا گیا۔ اگرچہ گرامی کی ماہوار معقول تھی لیکن ان کی فضول خرچیاں ہمیشہ ان کو تنگ دست رکھتی تھیں۔ چناں چہ ایک بار نظام کی خدمت میں گلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے شہنشاہ آفتاب ضمیر — چہ دہم شرح بے پروبالی
طبع من پست شد چو ہمت من — از تہی دستی و کہن سالی
شاعر شاہم و چنین مفلس — نقلِ ہر محفلم ز نقالی
با گرامی دوکم دو صد دہند — قدر را بودہ چار صد حالی

علامہ اقبال ہمیشہ گرامی کی فکر و شاعری کے دلدادہ تھے چناں چہ اپنے خط ۹ر فروری ۱۹۲۲ء میں لکھتے ہیں۔ ''گرامی جہانگیری بہار کا آخری پھول ہے جو ذرا دیر سے شاخ سے چھوٹا۔ افسوس آج خان خاناں نہ ہوئے کہ ان کو معلوم ہوتا خاک پنجاب، شیراز اور نیشاپور سے کسی طرح کم نہیں''۔

گرامی فطرتاً بڑے سست اور نازک مزاج تھے۔ خطوط کے جواب اور مسافرت سے کتراتے تھے وعدے کرتے لیکن بہت کم نبھاتے چناں چہ علامہ کے اکثر خطوط انہی مسائل کے متعلق طنز و شکوہ کے خوبصورت نمونے ہیں۔ گرامی نے کبھی اپنا کلام جمع کرنے کی فکر نہ کی۔ علامہ نے اس طرف توجہ دلائی لیکن ان کی زندگی میں کبھی یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا چنان چہ گرامی کے انتقال کے بعد ان کی رباعیات اور غزلیات کے دیوان جدا جدا طور پر شائع کیے گئے۔ گرامی کو ان کی بیگم اقبال بیگم سے کوئی اولاد نہ ہوئی جس کی حسرت انھیں ایسی رہی کہ ہمیشہ خود کو ''نخل بے ثمر'' کہا کرتے تھے۔ اور اس ضمن میں ایک مثنوی نالہ گرامی در حسرت جوانی ان کے دیوان میں موجود ہے۔ گرامی بڑے خوش ذوق اور سیدھے سادہ فقیر منش آدمی تھے۔ ان کے واقعات پر لطف اور شوخ ہیں، جن میں ایک دو کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔ زندہ رود میں جسٹس جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ جب کبھی گرامی لاہور آتے تو علامہ اقبال کے پاس قیام کرتے۔ ایک دفعہ کئی ہفتہ لاہور میں طولانی قیام ہو گیا چناں چہ ان کی بیگم نے اُن کو

بلوانے کے لئے بیماری کا بہانہ کر کے ٹیلگرام بھیجا۔ ٹیلگرام دیکھ کر گرامی ہوشیار پور جانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ رات کے نو بجے تھے اور اس وقت کوئی گاڑی ہوشیار پور کو نہیں جاتی تھی چنان چہ گرامی کا اصرار اور تشویش دیکھ کر علامہ اقبال نے کہا کہ ابھی آپ کو بھجواتے ہیں پھر کہا کہ مولانا رباعی کے تین مصرع ہوئے ہیں اور چوتھا مصرعہ لگائے۔ مصرعوں کو سُن کر گرامی بیٹھ گئے اور مصرع لگانے لگے لیکن کوئی مصرعہ اقبال کو پسند نہ آیا اقبال اوپر جا کر سو گئے۔ تقریباً صبح تین بجے گرامی نے علامہ کے خادم علی بخش کو بھیج کر اقبال کو جگایا اور پھر کہا کہ اچھا مصرعہ لگ گیا تھا تو سونچا کیوں صبح تک انتظار کیا جائے۔ پھر اقبال سے سنگترے منگوانے کی خواہش کی چناں چہ علامہ نے علی بخش کو بھیج کر ۳ بجے صبح میوہ فروش کو جگا کر سنگترے منگوائے اور گرامی نے اُسے بڑے شوق سے کھایا۔ اس طرح تمام رات گذری لیکن گرامی کو ان کی بیگم کی علالت اور ٹیلگرام کی یاد نہ آئی۔ چنانچہ صبح ہونے پر علامہ نے انھیں ہوشیار پور روانہ کیا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نظام حیدر آباد کے دربار میں گرامی نے ایک خوب صورت غزل سُنائی جس سے متاثر ہو کر نظام نے انھیں کچھ اور سُنانے کا حکم دیا۔ گرامی نے قصیدہ اور چند غزلیں سُنا کر معذرت چاہی لیکن نظام نے مزید سُنانے کو کہا تو گرامی نے بے ساختہ پنجابی میں کہا۔ ''چھڈ یار ہُن میں تھک گیاں''۔

ایک بار گرامی نے دربار نظام میں دلکش غزل سُنائی تو نظام نے دو سیر سونا انعام کے طور پر عطا کیا۔ اس غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

آں پری گر از چمن گرم عتاب آید بروں — بلبل از گل، گل زبو، بو از گلاب آید بروں
یار گر آید بروں تا خوردہ مئے از میکدہ — مست از مستی و مستی از شراب آید بروں
تو بہ چشم ام آمدی من گریہ سر کردم بلے — آفتاب آید بہ چشم ام از دیدہ آب آید بروں

ترجمہ۔ اگر وہ پری چہرہ عتاب کے ساتھ چمن کے باہر نکلے تو بلبل پھول سے، پھول خوشبو سے اور خوشبو گلاب سے باہر نکل جائے گی۔ اگر یار شراب پئے بغیر میکدہ سے نکلے تو مست سے مستی اور مستی شراب سے باہر نکل جائے گی۔ جب تو میری آنکھوں میں سما گیا تو میں رونے لگا جیسا کہ آنکھوں میں سورج

آجانے سے آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

گرامی کے شاگرد عزیز الدین عظامی نے تاریخ وفات لکھی "غالب پنجاب مرد" (۱۳۴۵ ہجری)

علامہ اقبال نے اس دیرینہ اور ہمدرد دوست کے غم پر جو اشعار لکھے اس کا ایک شعر ان کی خاطرات کا مجموعہ بن کر یوں ظاہر ہوا۔

؎ یادایامی کے باتو گفتگو ہا داشتم
اے خوشا حرفی کہ گوید آشنا بہ آشنا

مولانا ندوی سے علامہ نے کیا دریافت کیا؟

غلام قادر گرامی کے بعد علامہ نے جس شخصیت سے سب سے زیادہ استفادہ کیا وہ مولانا سید سلیمان ندوی تھے جن کے نام علامہ کے (۶۰) ساٹھ سے زیادہ خطوط ہیں۔ مولانا سے علامہ کے دیرینہ تعلقات تھے۔ مولانا ندوی اقبالؔ اور سر راس مسعود کے ساتھ افغانستان کے وفد میں شامل ہو کر افغانستان بھی گئے تھے۔ علامہ مولانا سے اکثر دینی اور بعض وقت ادبی مسائل میں رجوع کرتے تھے۔ اگرچہ ان خطوط اور مطالب کا مکمل ریویو ممکن نہیں لیکن کچھ خطوط کے انتخاب سے ہمارے مدعا کی تائید ہوتی ہے کہ سلیمان ندوی سے استفادہ بھی ادبی اور عالمانہ مباحث سے تعلق رکھتا تھا۔ علامہ اقبالؔ ۲۸/ اپریل کو سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔ ''رموز بے خودی'' آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ ریویو کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ اقبالؔ آپ کی تنقید سے مستفیض ہوگا''۔ ۱۵/ مئی 1918 کو لکھتے ہیں۔ ''صحت الفاظ اور محاورات کے متعلق جو آپ نے لکھا ہے ضرور صحیح ہوگا۔ اگر آپ نے غلط الفاظ اور محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے اُن سے آگاہ کیجیے۔ دوسرے ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو جائے گی۔ اس تکلیف کو میں ایک احسان تصور کروں گا''۔ علامہ ۱۳/ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں۔ ''قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا بالکل بجا ہے مگر چونکہ شاعری اس مثنوی (اسرار خودی) سے مقصود نہ تھی اس واسطے میں نے بعض باتوں پر عموماً تساہل برتا۔ اس کے علاوہ مولانا رومؔ کی مثنوی میں قریباً ہر صفحہ پر اس قسم کی قوافی کی مثالیں ملتی ہیں۔ اصول تشبیہ کے متعلق کاش آپ سے زبانی گفتگو ہو سکتی۔ قوت واہمہ کے عمل کے رو سے بیدلؔ اور غنیؔ کا طریق زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ''قطرہ از نرگس شہلا ستی'' یہ جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے میں نہیں سمجھ سکا۔ کیا آپ کا یہ مقصود ہے قطرہ کا لفظ شہلا کے لئے موضوع نہیں۔ جیسے فرصت ملے جزئیات سے بھی آگاہ فرمائیے''۔

۲۳/ اکتوبر 1918ء کے مکتوب میں سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں ''سیر'' فارسی میں ان معنوں میں آتا ہے۔ ''سیر کردن'' ''سیر زدن'' ''سیر داشتن'' بلکہ سیر دیدن۔

عمریا صائبؔ بہ شہر عقل بودم کوچہ بند　　　مدتی ہم با غزالان سیر صحرائی زنم

(ترجمہ۔اے صائب ایک عمر میں شہر عقل کے کوچوں میں بند رہا اور مدت سے غزالوں کے ساتھ صحرا کی سیر کر رہا ہوں)۔لفظ ''نعرہ'' حیوانات کی آواز کے لئے بھی آتا ہے۔اس وقت نعرۂ اسد کی سند موجود ہے اور مجھے یاد ہے شیر کے لئے بھی مستعمل ہوا ہے۔دشت اور بیشہ مرادف بھی آتے ہیں اور دشت کے لئے ضروری نہیں کہ بالکل خشک ہو۔

مپرس از آب و رنگ کوہسارش ہزاران دشت لالہ داغدارش

(ترجمہ۔اس کوہسار کا آب ورنگ نہ پوچھ ہزاروں لالہ صحرا اس سے داغ بردل ہیں)

۳۰/اکتوبر کے مکتوب میں ندوی کو لکھتے ہیں۔ ؎ازگل غربت زمان گم کردۂ۔

آپ کا ارشاد اس مصرع پر یہ تھا کہ ''ازگل'' بہ معنی بدولت اچھے معنوں میں آتا ہے۔بُرے معنوں میں نہیں آتا۔بہار عجم میں زیر لفظ ''گل'' یہ محاورہ بھی دیا ہے اور اشعار بھی دیے ہیں۔

ع۔زیر دست چرخ بودن ازگل بے فطرتی است

۳/اپریل ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں ''میری خامیوں سے مجھے ضرور آگاہ کیجئے۔آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن مجھے فائدہ ہوگا۔''بادہ نارسا'' کے لئے مجھے کوئی سند یاد نہیں۔بادہ نارس یا میوہ نارس لکھتے ہیں۔لفظ ''مینار'' غلط ہے۔صحیح لفظ ''منار'' ہے۔یہ لفظ اُس زمانے کی نظموں میں واقع ہوئے ہیں جس زمانے میں میں سمجھتا تھا کہ لٹریچر میں ہر طرح کی آزادی لے سکتے ہیں۔یہاں تک کہ بعض نظموں میں میں نے اصول بحر کا بھی خیال نہیں کیا اور ''ارادۂ''۔

۱۵/اکتوبر ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں۔''شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔اس بات کہ مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں اُن کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں اس واسطے کے آرٹ (فن) غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لئے ممکن نہیں۔جرمنی کے دو بڑے شاعر بیرسٹر تھے یعنی گوئٹے اور اوہلنڈ۔گوئٹے تھوڑے دن پریکٹس کر کے ویمر کی ریاست کا تعلیمی مشیر بن گیا اور اس

طرح فن کی باریکیوں کی طرف توجہ دینے کا اُسے پورا موقع مل گیا اوبلنڈ تمام عمر مقدمات پر بحث کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑی نظمیں لکھ سکا اور وہ کمال پورے طور پر نشو نما نہ پا سکا جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اگر احباب تبصرہ پر مصر ہیں تو یہی بہتر ہے کہ مجموعہ کا انتظار کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا"۔

۲۰ر اپریل ۱۹۲۲ء کو سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔ "مرزا غالبؔ کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے"۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃ للعالمین ہم بود

حال کے ہیئت دان کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی ممکن ہے اگر ایسا ہو تو رحمت للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے۔ اس صورت میں کم از کم محمدیتؐ کے لئے تناسخ یا بروز لازم آتا ہے۔ ۲۹ر مئی ۱۹۲۲ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "خضر راہ کے متعلق جو نوٹ آپ نے لکھا اس کا شکریہ قبول فرمائے۔ جوش بیان کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا صحیح ہے مگر یہ نقص اس نظم کے لئے ضروری تھا۔ اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دئے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوش بیان بہت بڑھا ہوا ہے اور جناب خضر کے انداز طبیعت سے موافقیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ بند اب کسی اور نظم کا حصہ بن جائیں گے"۔ یکم فروری ۱۹۲۴ء کو سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔ "میں آپ کا نہایت شکر گذار ہوں گا اگر آپ ازراہ عنایت اپنے وسیع معلومات سے مجھے مستفیض فرمائیں۔ کم از کم ان کتابوں کے نام تحریر فرمائے جن کو پڑھنا ضروری ہے"۔ علامہ ادبی مسائل ہی نہیں بلکہ مذہبی مسائل بھی مولانا سے دریافت کرتے تھے چناں چہ ۲۷ر اگست ۱۹۲۴ء کو لکھتے ہیں۔ "اگر صحابہ کے اجماع نے کوئی حکم نص قرآنی کے خلاف نافذ کیا تو علامہ آمدی کے خیال کے مطابق ایسا کسی ناسخ حکم کی بنا پر ہوا ہے۔ وہ ناسخ حکم سوائے حدیث نبویؐ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ناسخ قرآن ہو سکتی ہے جس سے کم از کم مجھے تو انکار ہے اور غالباً آپ کو بھی ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ دوبارہ زحمت دینے پر مجبور ہوا"۔

علامہ اقبال کے خطبات زمان اور مکان پر بہت مقبول ہوئے انہی مضامین کے بارے میں ۷/ مارچ اور ۱۸ مارچ ۱۹۲۸ء کو لکھتے ہیں۔ ''شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں۔ ان میں ایک قول یہ ہے کہ خدا زمان ہے۔ بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے۔ کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلمبند فرما کر مجھے ارسال فرمادیں۔ میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا صرف خلاصہ چاہتا ہوں جن کے لکھنے سے غالباً آپ کا بہت سا وقت ضائع نہ ہوگا''۔ ان خطوط کے پانچ سال بعد ۸/ اگست ۱۹۳۳ء میں سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔ ''حضرت محی الدین ابن عربی کے فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث کس کس جگہ ہے۔ حوالے مطلوب ہیں۔ حضرات صوفیہ میں اگر کسی اور بزرگ نے اس مضمون پر بحث کی ہو تو اس کے حوالے سے بھی آگاہ فرمائیے''۔

۲۳/ اگست ۱۹۳۳ء کو لکھتے ہیں۔ ''جتنی آگاہی آپ نے دے دی ہے وہ اگر زمانہ فرصت دے تو باقی عمر کے لئے کافی ہے۔ زمان و مکان و حرکت کی بحث اس وقت فلسفہ اور سائنس کے مباحث میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ میری ایک مدت سے خواہش ہے کہ اسلامی حکما و صوفیہ کے نقطہ نگاہ سے یورپ کو روشناس کرایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا بہت اچھا اثر ہوگا۔ میرے لکچر آکسفورڈ یونیورسٹی چھاپ رہی ہے۔ اُردو ترجمہ نیازی صاحب نے ختم کرلیا ہے۔ اس کی طباعت بھی عنقریب شروع ہوگی''۔

علامہ اقبال کے خطوط کی روشنی میں یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ نے مولانا ندوی سے بھی ادبی اور زیادہ تر تاریخی و مذہبی معلومات میں استفادہ کیا۔

کیا داغ دہلوی کے سوا علامہ کسی اور کے شاگرد رہے!

علامہ اقبال کس کے شاگرد رہے اور کن کن شخصیتوں سے شعروشاعری میں استفادہ کیا دو جداگانہ اور غور طلب مسائل ہیں۔ اقبالیات کے طالب علم اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ علامہ نے اپنی فکر اور علم کی وسعت کے لئے، اپنے اشعار کی نوک و پلک سنوارنے، اپنی زبان کی صحت اور فن شاعری کی باریکیوں سے واقف ہونے کے واسطے اُس زمانے کے منتخب جید عالموں سے فیض حاصل کیا لیکن سوائے داغ دہلوی کسی اور کو اپنا استاد نامزد نہیں کیا۔ علامہ اقبال کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ اپنی پینتالیس (۴۵) سالہ شعری زندگی میں گلشن ادب کے گل چیں بنے رہے چناں چہ تمام زندگی حُسن اور محاسن ادب کی تلاش میں مصروف رہے۔ علامہ اقبال کی ایک غزل سب سے پہلے ۱۸۹۳ء میں مجلّہ ''زبان'' دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ پروفیسر حمید احمد خان مدیر مجلّہ زبان نے اس غزل کے ساتھ اقبال کو شاگرد بلبل ہند داغ دہلوی لکھا تھا چناں چہ اقبال کو داغ دہلوی سے شرف تلمیذی کم از کم ۱۸۹۳ء سے رہا ہوگا۔ جہاں تک داغ کا تعلق ہے اقبال نے نہ صرف اس کا اظہار بلکہ فخر بھی کیا ہے۔ فروری ۱۸۹۶ء میں ایک بیس (۲۰) اشعار پر مشتمل نظم مجلّہ ''شور محشر'' کے دسمبر کے شمارے میں شائع کی اور مقطع میں داغ کی شاگردی پر یوں فخر کیا۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اُس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں کا

اگرچہ ۱۸۹۷ء میں جب داغ نے یہ لکھ بھیجا کہ '''اب تمھارے کلام کو اصلاح کی ضرورت نہیں'' یہ سلسلۂ شاگردی ختم ہوا لیکن اقبال کے دل میں داغ کی عزّت اور حرمت آخری عمر تک باقی رہی۔ داغ کی وفات پر اقبال کی چوبیس (۲۴) اشعار پر مشتمل نظم حقیقت میں ان کے جذبات کا مرثیہ ہے۔

آج لیکن ہم نوا سارا چمن ماتم میں ہے
شمع روشن بجھ گئی بزم سخن ماتم میں ہے

چل بسا داغ آہ میت اُس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

سری رام نے ''خمخانۂ جاوید'' میں لکھا ہے کہ اقبال شروع بچپن سے شعر اور استعداد شعر گوئی رکھتے تھے۔

انھوں نے اپنی مادری زبان پنجابی میں شاعری شروع کی اگر چہ آج وہ نمونے محفوظ نہیں۔ بعد میں شمس العلماء میر حسن کی رہنمائی میں اُردو میں شعر کہنے لگے۔ میر حسن کی ہی ہدایت پر علامہ نے داغ سے رشتہ تلمیذ برقرار کیا۔ علامہ خود کو شمس العلما کی زندہ تصنیف کہا کرتے تھے اور اُن سے مسلسل استفادہ کرتے رہے لیکن جہاں تک فن شاعری میں استاد اور شاگرد کے رشتے کی بات تھی وہ داغ ہی تک محدود رہی۔

''شعر اقبال'' میں عابد علی عابد نے لکھا ہے کہ اقبال نے ارشد گورگانی کو اپنا ابتدائی کلام دکھایا ہے لیکن دوسرے محققین نے اس بات کی تصدیق نہیں کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہزادہ ارشد گورگانی اقبال کے مدّاح تھے چناں چہ لاہور کے ایک مشاعرے میں جب اقبال نے یہ خوبصورت شعر پڑھا۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

تو آپ تعریف کر کے کہنے لگے اقبال! اس عمر میں یہ شعر!!

علامہ اقبال کے حبیب الرحمان خان شیروانی کے نام ۱۹۰۳ء مارچ سے اگست کے درمیان تین خطوط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شیروانی صاحب نے کچھ اشعار پر اصلاح دی تھی جس پر اقبال نے لکھا۔ ''آج مجھے اپنے ٹوٹے پھوٹے اشعار کی داد مل گئی۔ بعض جگہ جو تنقید آپ نے فرمائی ہے بالکل درست ہے بالخصوص لفظ ''چبھ'' کے متعلق مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے کیوں کہ یہ بات میرے خیال میں مطلق نہ تھی۔ آپ لوگ نہ ہوں تو واللہ ہم شعر کہنا ہی ترک کر دیں''۔

پھر مئی ۱۹۰۳ء کے خط میں لکھتے ہیں آپ کا خط حفاظت سے صندوق میں بند کر دیا ہے۔ نظر ثانی کے وقت آپ کی تنقیدوں سے فائدہ اٹھاوں گا۔ اگر میری ہر نظم کے متعلق آپ اس قسم کا خط لکھ دیا کریں تو آپ کا نہایت ممنون ہوں گا''۔

علامہ اقبال نے اکبر الہ آبادی، خواجہ حسن نظامی، مولانا سلیمان ندوی اور غلام قادر گرامی سے فن شاعری میں مباحثہ، مشورہ اور استفادہ کیا لیکن کسی کو بھی اپنا استاد سخن نہیں کہا۔ علامہ اقبال اکبر الہ آبادی کو اپنا پیر و مرشد تصور کرتے تھے اور تہ دل سے اُن کی عزت و احترام کے قائل تھے۔ ''مکاتیب اکبر''

کے ترتیب کار مرزا سلطان احمد کے دیباچہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے پاس اکبر کے کئی خطوط موجود تھے لیکن افسوس کے وہ خطوط شائع نہ ہو سکے۔ اس وقت ادب کے دامن میں صرف اکبر کے پانچ خطوط بنام اقبال موجود ہیں جن میں سے دو خط ''اقبال نامہ'' اور تین خطوط اقبال کے انتقال کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلہ ''راوی'' کے خصوصی ''اقبال نمبر'' میں شائع ہوئے تھے۔ البتہ اقبال نے جو اکبر کے نام خطوط لکھے اُن میں سے سولہ (۱۶) خطوط شیخ عطاءاللہ کے مرتب کردہ ''مجموعۂ خطوط اقبال'' میں شامل ہیں۔ علامہ ۱۸/اکتوبر ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں ''آپ کے خطوط سے مجھے نہایت فائدہ ہوتا ہے اور مزید غور و فکر کی راہ کھلتی ہے اسی واسطے میں ان خطوط کو محفوظ رکھتا ہوں کہ یہ تحریریں نہایت بیش قیمت ہیں اور بہت لوگوں کو اُن سے فائدہ پہنچنے کی امید ہے''۔

۱۱/دسمبر ۱۹۱۴ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

؎ جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

سبحان اللہ۔ کس قدر باریک اور گہرا شعر ہے۔ آپ نے بنگال کے سمندر کو ایک قطرہ میں بند کر دیا۔

اقبال ۲۰/اپریل ۱۹۱۹ء کے خط میں اکبر کو لکھتے ہیں ''چند روز ہوئے ایک مصرع ذہن میں آیا تھا۔ دوسرا مصرع نہیں ہو سکا۔ ؎ این سر خلیل است با آذر نتوان گفت
غور فرمائے۔ کچھ ذہن میں آئے تو مطلع کیجئے''۔

۱۶/جولائی ۱۹۱۴ء کے خط میں اکبر الہ آبادی کو لکھتے ہیں ''اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال پوچ گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہوگا کیوں کہ شاعری سے میرا مقصد حصول دولت و جاہ نہیں محض اظہار عقیدت ہے''۔

اقبال اور اکبر کی ملاقاتیں اور نامہ نگاریاں دراصل دو عظیم مفکروں، دو اسلامی فلاسفروں اور دو عظیم شاعروں کی انجمن آرائیاں معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے اور ایک دوسرے کے اشعار کی داد دیتے اور لیتے ہوئے سرشار اور خوش نظر آتے ہیں۔ اکبر اپنے خط ۲۷/اکتوبر ۱۹۱۱ء میں لکھتے

ہیں۔'' آپ کی نظم سوز میں نے پڑھی۔ ماشاء اللہ چشم بددور۔ اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو چشم بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اس عمر میں بلا تجربہ دنیا آپ کے دل کی نظر کم سے کم اخلاقی حقایق کی طرف ہے۔

؎ کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر

کس قدر بلیغ وصحیح ولبریز معنی ہے۔ اگر چہ یہ لطیف وخوبصورت وبلیغ ترکیب الفاظ آپ کی علمی قابلیت اور خاص شاعرانہ سلیقہ کا لہجہ ہے"۔ علامہ کے خطوط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ انگلستان کے قیام کے دوران خواجہ حسن نظامی کی نثر نگاری اور صحت زبان پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ اگر میں خواجہ نظامی کی طرح نثر لکھنے کا ہنر رکھتا تو ہرگز شاعری کو اپنے اظہار کا وسیلہ نہیں بناتا۔ حسن نظامی کے قول کے مطابق اقبال کی مثنوی ''اسرار خودی'' کا نام خود خواجہ نظامی نے تجویز کیا تھا اگر چہ زندہ رود میں جسٹس جاوید اقبال نے لکھا کہ مثنوی کا نام خود اقبال نے منتخب کیا۔ اسرار خودی پر قلمی جنگ سے قبل علامہ اقبال نے ۱۶ر فروری ۱۹۱۶ء کو لکھا ''وہ مثنوی جو حقیقت واستحکام پر بحث ہے اب قریباً تیار ہے اور پریس جانے کو ہے اس لئے کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمائے۔ شیخ عبدالقادر نے اس کے نام اسرار حیات پیام سروش، پیام نو اور آئین نو تجویز کئے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمائے اور نتائج سے مطلع کیجئے تا کہ میں انتخاب کر سکوں''۔

مولانا گرامی علامہ کے استاد کیوں نہیں؟

غلام قادر گرامی کی زندگی میں "رسالہ شمع" کے ایڈیٹر جناب حسن عابد جعفری نے ۱۹۲۵ء کے شمارے میں مولانا گرامی کی ایک فارسی غزل پر تعارفی نوٹ میں لکھا کہ علامہ اقبال گرامی کے شاگرد ہیں۔ اس پر علامہ نے اُسی وقت ایڈیٹر کو خط لکھا کہ وہ گرامی کے شاگرد نہیں اور اس طرح موقتی طور پر یہ مسئلہ خاموش تو ہو گیا لیکن کئی اذہان میں حل نہ ہو سکا۔ اس مضمون میں اسی موضوع پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

اُردو اور فارسی شاعری میں استاد کا احترام اور شاگرد کی اطاعت لازم و ملزوم نظر آتی ہے۔ چناں چہ ادب کے دامن میں کئی ایسی روایتیں موجود ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بعض شعرا اپنا کلام اس وقت تک کسی کو نہیں سُناتے تھے جب تک کہ ان کے استاد اس کی اجازت دے دیں۔ اغلب شعرا اُستاد کی اصلاح اور تنقید کو حرف آخر تصوّر کرتے اور استاد کے رنگ میں شعر کہنے کو اپنی کامیابی سمجھتے۔ استاد کا ذکر عوام میں بغیر کسی جھجک بلکہ فخریہ انداز میں کرتے خصوصاً اگر استاد صاحب معرفت اور شہرت ہوتا۔ مرزا غالبؔ کے شاگردوں کے نام سے کون واقف نہیں۔ علامہ اقبال داغؔ دہلوی کی شاگردی پر فخر کرتے تھے اور مشہور ہے کہ داغؔ دہلوی بھی علامہ اقبال کا ذکر خاص انداز میں کرتے تھے۔

علامہ اقبال کے تقریباً (۱۴۵۰) خطوط موجود ہیں جن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے مولوی میر حسن، اکبر الہ آبادی، حبیب خان شیروانی، سید سلیمان ندوی اور غلام قادر گرامی سے استفادہ ضرور کیا تھا لیکن وہ رشتہ' تلمیذ جو داغؔ کے ساتھ مخصوص تھا کسی اور کے ساتھ نہ تھا۔ مولانا گرامی کے ساتھ علامہ اقبال کا طریقہ' کار جداگانہ تھا جو عام استاد اور شاگردی رشتے سے بالکل مختلف تھا۔

خطوط کے مطالعہ سے جو حقائق سامنے آئے ان کو سہولت کی خاطر یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اقبال نے عام طور سے چیدہ چیدہ اشعار پر نشان دہی کر کے اصلاح یا رائے حاصل کی۔

۲۔ اگر اصلاح پسند آئی اُسے بہ شکریہ قبول کیا ورنہ اُس پر توجہ نہ کی۔

۳۔ بعض مقامات پر اصلاح یا تنقید پر اعتراضات بھی کئے اور اس کے جواز میں معتبر حوالے پیش کئے۔

۴۔ بعض اوقات خود مولانا گرامی کے اشعار پر تنقید کی اور اُس کو بہتر طور پر پیش کیا۔

۵۔ خطوط میں ادبی مشورے کے علاوہ بے تکلفی، شوخی، طنز و مزاح، نجی گفتگو، مقدمات دیوانی، بیماری کے ساتھ ساتھ فلسفہ، تصوّف، فارسی شاعری پر بحث و مباحثہ کے علاوہ تنقید، تفسیر اور تعریف کے حوالے شامل ہیں جو عموماً استاد اور شاگرد کی اصلاح کے مراسلات میں نظر نہیں آتے۔

۶۔ علامہ مولانا گرامی سے عمر میں اکیس (۲۱) سال چھوٹے تھے لیکن ۱۹۰۳ء سے یار آنہ اور بے تکلفی اس حد تک تھی کہ انھیں مولانا نومی، بابا گرامی اور گونا گوں القاب سے یاد کرتے جو استاد شاگرد شریعت میں روا نہیں۔

۷۔ علامہ بعض اوقات مصرع طرح دیتے اور اُس پر غزل لکھنے کی تاکید کرتے چناں چہ دیوان گرامی میں ایسی غزلیات زیادہ ہیں۔

۸۔ جو شعر اچھا کہیں مل جاتا اُسے گرامی کے خط میں لکھتے اور صحت زبان، فن کی باریکیوں اور مسائل تصوف و فلسفہ پر بحث و مباحثہ کرتے۔

۹۔ علامہ اقبال گرامی کی بڑی قدر کرتے اور ہر لحظہ ان سے استفادہ کر کے اپنے اشعار کے نوک و پلک سنوارتے رہتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ شعر گوئی کا خاص مزا اور طبع ماحول پر منحصر ہے۔

۱۰۔ گرامی بھی اقبال کو اپنے سے عظیم شاعر تسلیم کرتے تھے چناں چہ اپنے ایک خط میں خان نیاز خان کو لکھتے ہیں۔ ''ڈاکٹر اقبال مجدد ہیں، فلاسفر ہیں، ادب رموز ہند ہیں۔ گرامی ان کا سا دماغ کہاں سے لائے۔ دو تین شعر کہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت عالی میں بھیج دیجئے۔ ان کی داد سمیٹے دوسروں کی دادیں بے داد''۔

۱۱۔ اسی لئے جب ۱۹۲۵ء میں ایڈیٹر رسالہ شمع نے علامہ اقبال کو مولانا گرامی کا شاگرد لکھا تو اقبال اور گرامی دونوں نے اس اطلاع کی تردید کی۔

اگرچہ علامہ اقبال کے تقریباً (۹۰) نوّے خطوط ان بیان کی گئی باتوں پر دلیل ہیں لیکن ہم صرف چند ضروری اقتسابات پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ علامہ بے شک گلشن گرامی کے گل چین تھے لیکن وہ ان کے شاگرد نہ تھے۔

مولانا گرامی کا پہلا ذکر علامہ اقبال کے خط مورخہ ۱۱ر مارچ ۱۹۰۳ء میں ملتا ہے جن دنوں مولانا اقبال کے پاس سکونت کرتے تھے۔ ۱۹۱۵ کے خط میں علامہ اقبال لکھتے ہیں۔ ''بابا گرامی سلام۔ دو خطوں کے جواب آپ کے ذمے ہیں۔ آپ کس غفلت میں قیام پذیر یا تشریف فرما ہیں۔ جواب لکھئے اور جلد اشعار کے متعلق میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دیجئے''۔

۳ر ستمبر ۱۹۱۲ء کے خط میں اقبال لکھتے ہیں۔ ''آپ کا تخلص گرامی کی جگہ نومی ہونا چاہیے تھا کیوں کہ آپ سوتے بہت ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ روان لنکا کے بادشاہ کی طرح آپ چھ ماہ سوتے اور چھ ماہ جاگتے ہیں۔ ۴ر دسمبر ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں فارسی ادب کی چند نہایت عمدہ نظم ونثر کی کتابوں کے نام تجویز فرمائے جو آپ کے نزدیک نہایت عمدہ ہیں۔ اس خط کو نہایت ضروری تصور کریں''۔

۱۳ر جولائی ۱۹۱۴ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''مولانا گرامی آپ کہاں ہیں۔ حیدرآباد میں ہیں یا عدم آباد میں۔ اگر عدم آباد میں ہیں تو مجھے اطلاع دیجئے تا کہ آپ کو تعزیت نامہ لکھوں۔ صدیاں گزر گئیں کہیں آپ کا کلام دیکھنے میں نہیں آیا۔ کبھی کبھی چند اشعار بھیج دیا کرو تو کون سی بڑی بات ہے۔ میری شاعری گھٹ کر اب اسی قدر رہ گئی ہے کہ اوروں کے اشعار پڑھ لوں۔ گزشتہ سال ایک مثنوی فارسی لکھنی شروع کی تھی ہنوز ختم نہیں ہوئی۔ خدارا جلد آئے۔ سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ آ کر میری مثنوی سُنیے اور اس میں مشورہ دیجئے۔ امید ہے کہ بابا گرامی اچھا ہوگا اور نئے نکاح کی فکر میں اپنے آپ کو نہ گھلاتا ہوگا''۔

۲۸ر جنوری ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''غزل پڑھ کر نہایت مسرت ہوئی۔

ع۔ بہ دست عقل دہند از شکست توبہ کلید

نے پہروں بے قرار رکھا۔ سبحان اللہ۔ آج ہندوستان میں کون ہے جو یہ تمزک لکھ سکتا ہے۔ گرامی معجز نگار ہندوستان کے لئے سرمایہ ناز ہے۔ آج ایران میں بھی ایسا سحر طراز نہ ہوگا۔ زندہ باش اے پیر کہن۔ ہاں چند شعر اور لکھتا ہوں۔ اس خیال سے نہیں کہ اپنے اشعار سُناوں بلکہ اس خیال سے کہ شاید آپ کو تحریک ہو اور آپ سے نیے اشعار سنوں''۔ ۱۸ جنوری ۱۹۱۵ء کو لکھتے ہیں۔

''مثنوی ختم ہوگئی ہے۔ آپ آئیں تو آپ کو دکھا کر اس کی اشاعت کا اہتمام کروں مگر فیر وری مارچ تو محض وعدۂ معشوقانہ معلوم ہوتا ہے۔ گرامی سے حیدر آباد نہیں چھوٹ سکتا۔ کاش میں خود حیدر آباد پہنچ سکوں مگر یہ بات اپنے بس کی نہیں۔ اُردو اشعار لکھنے سے دل برداشتہ ہوتا جاتا ہوں۔ فارسی کی طرف زیادہ میلان ہوتا جاتا ہے اور وجہ یہ ہے کہ دل کا بخار اُردو میں نکال نہیں سکتا۔ چند اشعار عرض کرتا ہوں''۔ علامہ نے پھر چھ اشعار لکھے جو پیام مشرق میں شامل ہیں۔ صرف تیسرا شعر حذف کر دیا گیا ہے۔ پھر علامہ پانچ مہینوں کے بعد ۵ر مئی ۱۹۱۵ء کو لکھتے ہیں۔ ''مثنوی ختم ہوگئی اب اس کی اشاعت کا اہتمام درپیش ہے۔ چھپ جانے پر انشاء اللہ ارسال خدمت کروں گا۔ کاش آپ یہاں ہوتے یا میں حیدر آباد میں ہوتا تو پریس میں جانے سے پہلے آپ کے ملاحظہ سے گذر جاتی۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ حیدر آباد تو دور ہے لکھنو جا کر خواجہ عزیز کو سناؤں لیکن لاہور کے علایق نہیں چھوڑتے''۔

۱۸ر ڈسمبر ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''مندرجہ زمین میں غزل بھی لکھ لائیے۔ انکار نہ ہو ورنہ ہمارا آپ کا کوئی یارانہ نہیں۔ ؎ خوش آں کہ رخت خرد از شعلۂ می سوخت''

علامہ اقبال بعض اصلاحات یا تنقیدات کو قبول نہیں کرتے تھے چناں چہ فیر وری ۱۹۱۷ء کو لکھتے ہیں۔ ''درس از سیماب گیرد زندگی'' لاجواب مصرع ہے۔ مگر اس مقام کے لئے موزوں نہیں۔ یہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حقیقی زندگی یہ ہے کہ انسان اپنی راہ کی رکاوٹوں پر غالب آئے۔ یعنی بہ الفاظ دیگر زندگی کی کُنہ استیلا ہے میں نے اس شعر کی جگہ مندرجہ ذیل شعر لکھا ہے۔ آپ کا مجوزہ مصرع کسی اور جگہ کام دے گا۔

زندگانی سوختن سوزیدن است خویش را بر سبک رہ دوزیدن است

اس شعر کو ملاحظہ فرمائیے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے''۔

۱۹ر فیر وری ۱۹۱۷ء کو علامہ گرامی کو لکھتے ہیں۔ ''آج کل حضرت حسینؓ کے واقعہ شہادت کا تاریخی مضمون نظم کر رہا ہوں۔ اس میں ضمناً چند شعر عقل اور عشق پر ہیں جو عرض کرتا ہوں''۔ اس کے بعد اقبال چند شعر لکھتے ہیں۔

مولانا گرامی کی ایک خوبصورت غزل ملنے پر علامہ اقبال نے ۲۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو لکھا کہ ''سبحان اللہ کیسی دل آویز غزل ہے۔ ایک ایک شعر پر دل تڑپتا ہے۔ کس کس کی داد دوں۔ اگر آپ اس طرح کلام ارسال فرماتے رہیں تو میں تھوڑے عرصے میں آپ کا مجموعہ تیار کر کے دنیا کے سامنے اس بیش بہا خزانے کو پیش کر دوں گا۔ اس زمانہ انحطاط میں کسی مسلمان کا ایسا کلام ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قوم میں زندگی کی قوتیں ابھی باقی ہیں''۔

مولانا گرامی اقبال کو جواب میں لکھتے ہیں۔ ''ڈاکٹر صاحب تسلیم۔

ہست این مے کدہ دعوت عام است این جا　　قسمت بادہ با ندازۂ جام ست این جا

سبحان اللہ۔ کیا شعر ہے۔ مصرع ثانی جواب نہیں رکھتا۔ دعوت عام دلیل اثبات۔

حرف آن راز کہ بیگانہ زصوت است ہنوز　　ازلب جام چکیدست وکلام است این جا

واہ واہ۔ راز کو حرف اور صوت کا لباس پہنا دو تو وہ کلام ہو جاتا ہے اور کلام کی تعریف بھی یہ ہے کہ وہ حرف اور صوت سے مرکب ہو۔

دوش دربت کدہ مستانہ در آمد اقبال　　گردش چشم تبان گردش جام است این جا

اقبال کی ایک اور غزل عرفی کی غزل کا جواب ہے بلکہ بڑھ کر۔

ایک غزل خدمت میں بھیجا ہوں۔ غور سے اس غزل کو دیکھیں اور لکھیں''۔

اقبال نے پھر ۲ر ڈسمبر ۱۹۱۸ء کو لکھا۔ ''غزل کیا ہے دفتر معرفت ہے۔ یہ غزل کئی دفعہ آپ سے سُن کر مزے لے چکا ہوں۔ آج قند مکرر کا مزہ دے گئی۔ فلسفہ حال کے بعض حقائق اس اشعار میں ایسی خوبی سے نظم ہوئے ہیں کہ اگر ان حقائق کو مغربی معلم سُنیں تو پھڑک جائیں۔ اس جگر کاوی کا اندازہ لوگ نہیں لگا سکتے۔ ان کے سامنے شعر بنا بنایا آتا ہے وہ اس روحانی اور لطیف کرب سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ جہاں اچھا شعر دیکھو سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے۔ اچھے خیال کا پیدا کرنا اوروں کے لئے کفارہ ہوتا ہے۔ مجھے میرا مصرعہ ابھی تک کھٹکتا ہے۔ طبیعت حاضر ہو تو پھر غور کروں گا''۔

علامہ اقبال ۱۶ر فروری ۱۹۱۹ء کو لکھتے ہیں۔ مصرع ''این سر خلیل است'' حاضر ہے تصرف بے جا کی

کون سی بات ہے۔ آپ کا مال ہے مگر آپ نے جو مصراع لگائیں ہیں قلب کو تسکین نہیں ہوئی۔ قلب کچھ اور مانگتا ہے اور معلوم نہیں کیا۔ غزل پوری کر کے ارسال فرمائے۔

باسوختگاں قصہ زکوثر نتواں گفت۔ خوب مصرع ہے۔ اقبالؔ بھی غزل ضرور لکھے گا۔ مگر گرامی کی حلاوت کہاں سے لائے گا۔ عجیب وغریب مضامین خیال میں آرہے ہیں لیکن ان کی تکمیل کے لئے فرصت اور وقت کہاں سے آئے گا "۔

۱۶/مارچ ۱۹۱۹ء۔ کیا خوب گرامی تو اقبالؔ کو پورا سال ٹالتا رہا اور اقبالؔ ایک ہی خط میں آجائے۔ پہلے آپ لاہور تشریف لائیں پھر اقبالؔ بھی جالندھر آئے گا۔ آپ کی غزل لاجواب ہے۔

؎ عشوہ مفروش کہ محمود غلام است اینجا۔ للّٰہ درک۔ گرامی خود بڈھا مگر اس کا فن جوان ہے۔ "آفتاب لب بام" بھی خوب نکلا لیکن خام ابھی باقی ہے۔ اس پر ضرور لکھیے۔ اقبالؔ نے گرامی کے جن اشعار کی داد دی وہ دیوان گرامی میں اس طرح ہیں۔

با دل شدگان قصہ زمحشر نتواں گفت　　باسوختگاں حرف زکوثر نتواں گفت
آں رمز جلیل است ابو جہل چہ فہمید　　آں سرّ خلیل است بآذر نتواں گفت
دردیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبالؔ　　پیغمبری کرد و پیغمبر نتواں گفت

(ترجمہ۔ دل باختہ لوگوں سے حشر کا قصہ نہ کہا جائے۔ جو جلے ہوئے ہوں اُن سے حوض کوثر کا ذکر نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک بڑا راز ہے اسکو ابو جہل کیا سمجھے گا۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کا راز ہے اُسے آذر سے بیاں نہیں کیا جا سکتا۔ معنی پر نگاہ رکھنے والوں کی نظر میں حضرت اقبالؔ نے پیغمبری کی ہے مگر ان کو پیغمبر نہیں کہا جا سکتا۔)

علامہ جولائی ۱۹۲۰ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "بھلا یہ شعر کیسا ہے۔

کم نہ شود خزانہ ملت بے بہا نیست　　یک دو نفس زیادہ کن غنچہ نیم بازرا

مقصود یہ ہے کہ ترے پاس وقت کا لازوال خزانہ ہے پھر غنچہ کی عمر تھوڑی سی زیادہ کر دے تو اس میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ بہ نظر انتقاد ملاحظہ کیجئے۔ مولوی میر حسن کی خدمت میں بھی یہ شعر سیالکوٹ لکھا ہے

دیکھیں ان کی رائے کیا ہے؟ (نوٹ۔ یہ شعر اقبال کے کلام میں شامل نہیں)

علامہ جولائی ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "آپ کو معلوم ہوگا یہ عرفی کی غزل ہے جو مجھے کمزور نظر آئی ہے اس لئے اس پر غزل لکھنے کی جرات ہوئی ورنہ عرفی کی غزل پر غزل لکھنا گرامی کا کام ہے نہ اقبال کا"۔ علامہ اقبال گرامی سے فلسفہ اور تصوف پر بھی بحث اور مباحثہ کرتے تھے چناں چہ ۱۹۲۰ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "شاہ نعمت اللہ کرمانی کا مشہور قصیدہ "حالت روزگاری بینم" دیکھنے کے قابل ہے۔ ہندوستان میں جو اس کے مروّج ہیں، بہت غلط ہیں۔ پروفیسر براؤن نے جو نسخہ شائع کیا بہت صحیح ہے"۔

علامہ اقبال کے دو اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے گرامی لکھتے ہیں۔ "گرامی نے اقبال کو دیکھ لیا مگر ایک حسرت رہی وہ یہ کہ ہائی کورٹ کی ججی پر جلوہ افروز نہیں دیکھا۔ ہاں قلم روئی معانی میں گورنر کی کرسی پر جلوہ فرما دیکھتا ہوں اور یہی عہدہ جلیلہ ہے۔ فرمایئے الہام کا کیا حال ہے۔ وہ غزل پوری ہوئی پوری ہوگئی ہوگی مگر گرامی اس قابل نہیں کہ اس کو وہ الہام آمیز کلام بھیجا جائے۔

ز ستیز آشنایاں چہ نیاز و ناز خیزد   دلکے بہانہ سوزی نگہی بہانہ سازی

(ترجمہ۔ جو جنگ کے خواہشمند ہیں ان سے ناز و نیاز کیا ہوگا۔ ایک بہانہ دل اور ایک بہانہ ساز نگاہ)

یہاں پہلے مصرع کو دوسرے مصرع سے کوئی ربط نہیں۔ المعنی فی البطن شاعریوں چاہیے۔

دو شرارہ درکشاکش دو حریف در ستیزہ   دلکے بہانہ سوزی نگہای بہانہ سازی

یہ غزل پیام مشرق میں موجود ہے چناں چہ اقبال نے گرامی کی اصلاح قبول نہ کی اور شعر جس طرح سے پہلے اقبال نے لکھا تھا اُسی طرح باقی رہا۔

۳۱/مارچ ۱۹۲۱ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "مگر نخستیث مجموئی آپ کا (گرامی کا) مصرع کھٹکتا ہے۔

براو دست مرا رشتۂ امید دراز۔ بھلا اگر یوں لکھتے تو کیا ہو۔

ز فیض مژدہ لطف تو روز عیش دراز   ز عہد وعدہ وصل تو عمر غم کوتاہ

(ترجمہ۔ تمہارے لطف کی خوش خبری کے فیض سے روز عیش دراز ہے اور تمہارے وعدہ وصل کے عہد میں غم کی عمر کوتاہ ہوگی)۔

۳۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرامی کو لکھتے ہیں۔ ''کل ایک غزل کے چند اشعار آپ کی خدمت میں لکھے تھے ان میں سے ایک شعر یہ تھا''۔

زمن نوائے بلندے مجو کہ درد چمنم ہنوز زمزمہ پست است وخندہ زیر لبی است

گذشتہ رات چارپائی پر لیٹا تو طبیعت پھر اس شعر کی طرف عود کر آئی۔ اس ہیولی سے یہ صورت پیدا ہوئی

غزل بہ زمزمہ خواں پردہ پست تر گرداں ہنوز نالۂ مرغان نوائے زیر لبی است

رہ عراق وخراسان زن اے مقام شناس ۔ یہ شعر غزل سے نکال دیا ہے۔ عراق، خراسان مقام' ہندوستان میں کون سمجھے گا۔ جو اشعار آپ کو ناپسند ہے کاٹ دیجئے''۔

پھر علامہ ۵ر جنوری ۱۹۲۲ء کے خط میں گرامی کو لکھتے ہیں۔ ''آپ نے اس غزل کے اشعار پسند فرمائے مجھے تو آپ کے شعر نے تڑپا دیا۔

کتاب عقل ورق ورق فروخواندیم تمام حیلہ فروشی ومدعا طلبی است

آپ کا شعر پڑھتے ہی میری آنکھوں سے اس زور کے ساتھ آنسو امڈے کہ ضبط نہ ہو سکا۔ مضمون میرے حسب حال تھا۔ تمام عمر کتابوں کی ورق گردانی میں گزری اور آخر یہ معلوم ہوا کہ کتاب حیلہ فروشی اور مدعا طلبی کے سوا کچھ نہیں۔ آپ کے ایک ایک مصرع میں سو سو بوتل کا نشہ ہے اسی واسطے تو گرامی پیر مغاں ہے''۔ خدا جانے زندگی کب تک ہے کچھ عرصے کے لئے آجائے تا کہ میں بھی آپ کی صحبت سے مستفیض ہو جاؤں۔ یہ صحبتیں کسی زمانے میں تاریخ کے ورق بن جائیں گی۔ ہاں اس غزل کا آخری شعر بھی لکھ دوں۔

مسخ معنی من درعیار ہند و عجم کہ اصل ایں گہر از گریہ ہای نیم شبی است

بندگی باہمہ جبروت خدائی مفروش ۔ اس کی اصلاح کیجئے۔ لفظ ''ہمہ'' کھٹکتا ہے۔ اگر آپ کے خیال میں ''ہمہ'' لفظ قابل اعتراض نہیں تو پھر پہلا مصرع لکھ دوں گا۔

جب گرامی کا نام لے کر خان نیاز الدین خان نے نظم خضر راہ پر اعتراض کیا تو اقبال نے ۲۴ مئی ۱۹۲۲ء کو گرامی کو لکھا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ اقبال کے نزدیک آپ کا فرمودہ وحی والہام ہے نہ کسی اور کا۔ بلکہ آپ کے خط سے تو میرے خیال کی تائید ہوئی۔ میں نے آپ کو لکھا بھی تھا کہ یہ اعتراض آپ کا نہیں ہوسکتا۔ سننے والے کی غلطی ہوگی سو ایسا ہی ثابت ہوا۔ اگر کوئی شخص دنیا میں ایسا موجود ہے جس کو گرامی کی نیت اور نیک نفسی میں شبہ ہے تو وہ اقبال کے نزدیک کافر ہے۔ میں تو آپ کو ولی سمجھتا ہوں آپ کس خیال میں ہیں''۔

علامہ اقبال ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔ ''اللہ اللہ کیا خوب غزل لکھی ہے'' کہ در پردہ با پردہ در ساختم'' امید کہ غزل ختم ہوگئی ہوگی۔ باقی اشعار بھی ضرور روانہ فرمائے۔ نظری کا ایک شعر نظر سے گذرا۔

کسی کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

ساری غزل ہی خوب ہے۔ معلوم نہیں کبھی آپ نے بھی اس پر غزل لکھی یا نہیں۔ ایک شعر میرے ذہن میں بھی آ گیا۔

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است — حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

۲۸ اکتوبر ۱۹۲۳ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''اس شعر

زندانی کہ بند زپایش کشادہ اند — آہی گذاشت است کہ بو نام دادہ اند

مولوی اسلم جراج پوری کا اعتراض ہے کہ'' گذاشت است'' ذوق سلیم کو کھٹکتا ہے۔ مجھ کو ان کی ایراد میں صداقت ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن گرامی کا فتویٰ قطعی ہوگا۔ آپ اپنی صحیح رائے سے مطلع فرمائیں۔ اس شعر پر تنقیدی نظر ڈالے اور نتیجہ سے آگاہ کیجئے''۔

علامہ اقبال کا آخری خط گرامی کے نام ان کی وفات سے چار مہینے قبل کا یعنی ۳۱ جنوری ۱۹۳۷ء کا ہے۔ جس میں علامہ لکھتے ہیں۔ ''ڈاکٹر محمد حسین صاحب سے آپ کی علالت کا ذکر میں نے کیا تھا۔ وہ آپ کے علاج کے لئے تیار ہیں۔ لہذا امید ہے کہ اپنے علاج کی خاطر اور نیز مشتاقان زیارت کے خیال سے ضرور لاہور آئیے۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ دیرینہ ہم خیالوں کی صحبت میں جو دم گذر جائے

غنیمت ہے۔ اس کے علاوہ یہ عرض ہے کہ میری کتاب زبور عجم ختم ہوگئی ہے۔ اس کے چار حصے ہیں کل مجموعہ کا نام زبور عجم ہے۔ آپ ہر حصہ کا کوئی موزوں اور مناسب نام تجویز کریں تو عنایت ہو"۔

علامہ اقبال اور مولانا گرامی میں بے تکلفی اور شوخی آخری ملاقات تک برقرار رہی۔ چناں چہ ۱۵ر جنوری ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں۔ "علی بخش حاضر ہوتا ہے میں پہلے ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ آپ اتنے عرصے خضاب کرلیں ورنہ لاہور میں آکر کرلیجئے گا۔ میں نے مہندی اور دسمہ آپ کے لئے منگوا رکھا ہے"۔

۲۰ر جنوری ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں۔ "غزل کے چند شعر آپ کے تشریف لے جانے کے بعد ہو گئے تھے۔ شاید کچھ اور بھی ہو جائیں۔ آپ یہاں تھے تو تحریک تھی۔ آپ کے جانے سے وہ تحریک غزل خوانی بھی افسردہ ہو کر مر گئی۔ اقبال آپ کا پیر نہیں گرامی پیر اقبال ہے"۔

علامہ ۶ر فروری ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں۔ "غزل تنقید کے لئے ہی تو آپ کی خدمت میں ارسال کی تھی اس پر خوب تنقید کیجئے اور مفصل تحریر فرمائے۔ پھر میں انشاءاللہ نظر ثانی کروں گا"۔

علامہ اقبال سطحی تنقید کے قائل نہ تھے چناں چہ ۹ر فروری ۱۹۲۲ء کو گرامی کو لکھتے ہیں۔ "مہربانی کر کے غزل کے تمام اشعار پر اعتراض لکھیے تا کہ میں پورے طور پر مستفید ہو سکوں۔ آپ نے صرف ایک شعر کی تعریف کر دی اور باقی اشعار چھوڑ گئے۔ میں چاہتا ہوں اُن پر اعتراض کیجئے۔ آپ کے کسی شعر میں اگر کوئی بات مجھے کھٹکے تو میں بلا تکلف عرض کر دیتا ہوں۔ آپ کیوں ایسا نہیں کرتے مجھے تو تعریف سے اس قدر خوشی نہیں ہوتی جس قدر اعتراض سے کیوں کہ اعتراض کی تنقید سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ سند جو آپ نے لکھی ٹھیک معلوم ہوتی ہے مگر حق بات یہ ہے کہ ابھی میرا اطمینان نہیں ہوا۔ ایک شعر اور تلاش کر لیجئے۔ اسی واسطے تو میں کہا کرتا ہوں گرامی جہانگیری بہار کا آخری پھول ہے جو ذرا دیر کے بعد شاخ سے چھوٹا۔ افسوس کہ آج خان خاناں نہ ہوئے کہ اُن کو معلوم ہوتا کہ خاک پنجاب شیراز و نیشاپور سے کسی طرح کم نہیں"۔

علامہ ۱۷ر فروری ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں۔ غزل لکھنے کا لطف یکجائی میں ہے۔ آپ جالندھر میں، میں لاہور میں غزل کا لطف خاک آئے۔ اس مطلع میں "چناں" کا لفظ مجھے کھٹکتا ہے۔ مگر "بہار رخش" بھی

لطیف نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مطلع ہی لکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک دو شعر اور ذہن میں ہیں ملاحظہ کیجئے۔

زخاک تا بہ فلک ہر چہ ہست رہ پیاست   قدم گشائے کہ رفتار کارواں تیزاست

ترجمہ۔ زمین سے فلک تک ہر چیز راہی ہے قدم بڑھاؤ کہ کارواں کی رفتار تیز ہے)

''قدم گشائے'' پر اعتراض ہو تو ''دمے مائیت'' یا ''سبک خرام'' ہو سکتا ہے مجھے تو قدم گشائے ہی خوب معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے''۔

چونکہ تمام نوّے (۹۰) خطوط جو گرامی کے نام ہیں اُس پر مکمل بحث نہیں ہو سکتی اس لئے ہم نے ایک ایسا موضوع انتخاب کیا جس میں علامہ کے پانچ خطوط جو چھ ہفتے کے عرصے میں لکھے گئے اور اس (۱۹) اشعار کی نظم جو ''رموزِ بے خودی'' میں ''فاطمہ زھرا'' تمام مسلمان عورتوں کے لئے اسوۂ کاملہ ہیں'' کے ذیل میں ہیں۔ جو ہمارے مضمون کے موضوع کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ علامہ اقبال غلام قادر گرامی کے شاگرد نہیں بلکہ اُن کے گلشن فکروفن کے گل چین تھے۔

علامہ اقبال ۱۸ ارجون ۱۹۱۷ء کو مولانا گرامی کے خط میں لکھتے ہیں کہ'' آج کل فاطمہ زھرا کا مضموں زیرِ نظر ہے۔ دو شعر لکھے تھے جو ذیل میں عرض کرتا ہوں۔ بہ نظر اصلاح دیکھئے اور رائے سے آگاہ کیجئے۔

بہر محتاجی دلش آنگونہ سوخت   با یہودی چادر خود را فروخت

مختش پروردہ ی صبر و رضا   آسیا گردان و لب قرآن سرا

دوسرے شعر کا پہلا مصرع کھٹکتا ہے''۔

چونکہ گرامی کے خطوط جو اُنھوں نے اقبال کو لکھے ہمارے دسترس سے خارج ہیں اور ہمارے درمیان موجود نہیں اس لئے ہم صرف قیاس کر سکتے ہیں کہ دوسرے شعر کا پہلا لفظ ''مختش'' کو گرامی نے ''آں ادب'' کر دیا ہوگا کیوں کہ نظم میں اب شعر یوں ہے۔

آں ادب پروردہ یٔ صبر ورضا   آسیا گردان ولب قرآن سرا

(یعنی وہ ادب، صبر اور رضا کی آغوش کی پلی تھی جو چکی پیتے وقت بھی قرآن کی تلاوت میں مشغول رہتی تھی)۔ علامہ یکم جولائی ۱۹۱۷ کے خط میں مولانا گرامی کو لکھتے ہیں۔ ''البتہ فاطمہ زہراؑ کے متعلق ایک مضمون ذہن میں آیا ہے یعنی یہ کہ احترام وعزت اگر نسبتوں پر موقوف ہے تو مریم کو صرف ایک نسبت حاصل تھی یہ کہ وہ مسیح کی ماں تھی لیکن فاطمہؑ تین نسبتوں سے محترم ہیں۔

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز　　از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز
نور چشم رحمت للعالمینؐ　　آن امام اولین و آخرین
آنکہ جان در پیکر گیتی دمید　　روزگار تازہ آئین آفرید
بانوی آن تاجدار ھل اتی　　مرتضیٰؑ مشکل گشا شیر خدا
پادشاہ وکلبہ ئی ایوان او　　یک حسام ویک زرہ سامان او
مادر آں کاروں سالار عشق　　رونق ہنگامۂ بازار عشق (یہ مصرع کھٹکتا ہے)

(ترجمہ۔ اگر مریمؑ ایک نسبت مادر عیسیٰؑ ہونیکی وجہ سے محترم ہے تو حضرت فاطمہؑ تین نسبتوں سے محترم ہیں۔ فاطمہؑ رحمت للعالمینؐ کی نور چشمی ہیں جو اولین اور آخرین امام ہیں۔ جن کی بدولت دنیا نئی اور یہ روزگار اور زندگی خلق کی گئی۔ فاطمہؑ اُن کی ہمسر ہے جس کے سر پر ھل اتی کا تاج ہے جو مرتضیٰؑ مشکل کشا اور شیر خداؑ ہے۔ جو ایسا بادشاہ تھا کہ اس کا چھوٹا سا گھر اس کا ایوان تھا اور ایک تلوار اور ذرہ اس کا سامان تھا۔ فاطمہؑ عشق کے کارواں کے سالار کی ماں ہے جو بازار عشق کے ہنگامے کی رونق تھا)۔

علامہ اقبالؔ کے خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گرامی نے بتایا کہ دونوں مصرعوں میں آخری شعر کے 'مادر' آنا چاہیے چنانچہ اقبالؔ نے آخری شعر یوں کر دیا۔

مادر آن مرکز پرکار عشق　　مادر آں کارواں سالار عشق

علامہ اقبالؔ اپنے تیسرے خط بنام مولانا گرامی ۳ر جولائی ۱۹۱۷ء کو لکھتے ہیں۔ ''میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ اس فکر میں ہوں کہ حضرت سیدہؑ کے متعلق ایک ایسا شعر لکھا جائے جو معانی کے اعتبار سے ایک سو شعر کے برابر ہو۔ آج صبح آنکھ کھلتے ہی ہو شعر ذہن میں آیا ابھی اسے خراد کی ضرورت ہے۔

عرض کرتا ہوں۔

گریۂ شب ہائے آن بالا نشین ہم چو شبنم ریخت بر عرش برین

اس شعر کو بہ نظر غور فرمائے۔ ''بالانشین'' ''ریختن'' کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے مگر کسی قدر کھٹکتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا گرامی کے مشورے سے اقبال نے اس موضوع کو دو شعروں میں بیان کیا اور پہلے مصرع میں بھی تبدیلی کی۔

گریہ حامی او زبالین بے نیاز گوہر افشاندی بدامان نماز

اشک او بر چید جبریلؑ از زمین ہمچو شبنم ریخت بر عرش برین

ترجمہ۔ اُس بے نیاز گریہ میں جو آنسو گوہر کہ طرح نماز کی حالت میں اُس کے دامن اور زمین پر گرتے رہے اُسے جبریلؑ نے چنا اور شبنم کے مانند عرش بریں پر بکھیر دیئے۔

علامہ اقبال پھر ۶ر جولائی کو مولانا گرامی کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''آپ نے جو ترمیم کی وہ بہت بلند ہے۔ بہر حال اِسے سمجھتا ہوں اور چوں کہ آپ نے پیدا کیا ہے اِس کی داد دیتا ہوں۔ چون فاطمہؑ کے متعلق اشعار نظم کر رہا ہوں کیا آپ کو کوئی عمدہ روایت اُن کی طاعت گذاری یا تربیت اولاد کے متعلق یاد ہے جس کو نظم کیا جائے۔ معنی خیز دل گداز روایت ہو تو نظم کرنے میں لطف آتا ہے''۔

علامہ اقبال کا آخری خط اس ذیل میں ۱۶ر جولائی ۱۹۱۷ء کا ہے جس میں مولانا گرامی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ''ہاں فاطمہؑ کے متعلق جو اشعار میں نے لکھے تھے اُس کے آخر کے اشعار اس طرح سے ہیں''۔

مادر آن مرکز پرگار عشق مادر آں کاروان سالار عشق

آں یکی شمع شبستان حرم حافظ جمعیت خیر الامم

تا نشید آتش پیکار و کین پشت پا زد بر سر تاج و نگین

در نوای زندگی سوز از حسینؑ اہل حق حریت آموز از حسینؑ

سیرت فرزندہا از امہات جوہر صدق و صفا از امہات

مزرع تسلیم را حاصل بتولؑ   مادران را اسوۂ کامل بتولؑ
(ترجمہ فاطمہؑ مرکز پرکار عشق اور کاروان سالار عشق کی ماں ہے۔ ایک بیٹا حرم کے شبستان کی شمع جمعیت خیر الامم کا محافظ جس نے تخت و تاج کو ٹھوکر پر مارا۔ زندگی کے نغمہ میں سوز گداز حسینؑ سے ہے۔ اہل حق کے لئے حسینؑ درس آزادی ہے۔ اولاد کی سیرت نگاری اور اُن کی صدق وصفا کے جوہر کی نشونما ماں سے ہے۔ اسلام کی کشت کا ثمر فاطمہؑ ہے اور فاطمہؑ کی زندگی مادران کے لئے اسوۂ کامل اور اسوۂ حسنہ ہے)۔

اقبالؒ ۱۶ر جنوری ۱۹۱۷ء کے خط میں ان اشعار کو لکھنے کے بعد کہتے ہیں۔'' آپ نے لکھا تھا کہ دونوں مصرعوں میں ''مادر'' کا لفظ ہونا چاہیے۔ معلوم نہیں آپ کے ذہن میں کیا نکتہ تھا جس کے بیان کرنے کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔ میں نے اس اشارے سے فایدہ اٹھایا ہے کہ بعد کے شعر میں حسنؑ و حسینؑ دونوں کا ذکر کردیا ہے۔ اب ان اشعار کے بعد کا مضمون یہ ہے کہ ایسے بیٹوں سے جن کے یہ اوصاف ہیں ماں کی تربیت کا اندازہ کرنا چاہیے تا کہ معلوم ہو کہ اس ماں کی آغوش میں کیا تاثیر تھی جس میں ایسے بچوں کی پرورش ہوئی۔

علامہ اقبالؒ نے اس نظم کو ان آخری دو اشعار پر ختم کیا۔

رشتۂ آئین حق زنجیر پاست   پاس فرمان جناب مصطفیؐ است
ورنہ گرد تربتش گردید مے   سجدہ ھا برخاک او پاشید مے

یعنی اسلام کے آئین کی زنجیر میرے پاؤں میں ہے اور شریعت محمدی کا خیال بھی ہے ورنہ میں فاطمہؑ کی قبر کے طواف میں زندگی بسر کردیتا اور اُن کی قبر پر تمام عمر سجدے نچھاور کرتا رہتا۔

خلاصهٔ مطالب مثنوی

در تفسیر سورهٔ اخلاص

«قل هو الله احد»

من شبی صدیق را دیدم بخواب / گل ز خاک راه او چیدم بخواب

آن امن الناس بر مولای ما / آن کلیم اول سینای ما

همت او کشت ملت را چو ابر / ثانی اسلام و غار و بدر و قبر

گفتمش ای خاصهٔ خاصان عشق / عشق تو سر مطلع دیوان عشق

پخته از دستت اساس کار ما / چاره‌ای فرما پی آزار ما

گفت تا کی در هوس گردی اسیر / آب و تاب از سورهٔ اخلاص گیر

اینکه در صد سینه پیچد یک نفس　　سرّی از اسرار توحید است و بس
رنگ او بر کن مثال او شوی　　در جهان عکس جمال او شوی
آنکه نام تو مسلمان کرده است　　از دوئی سوی یکی آورده است
خویشتن را ترک و افغان خوانده‌ای　　وای بر تو آنچه بودی مانده‌ای
وارهان نامیده را از نامها　　ساز با خم در گذر از جامها
ای که تو رسوای نام افتاده‌ای　　از درخت خویش خام افتاده‌ای
با یکی ساز از دوئی بردار رخت　　وحدت خود را مگردان لخت لخت
ای پرستار یکی گر تو توئی　　تا کجا باشی سبق خوان دوئی
تو در خود را بخود پوشیده‌ای　　در دل آور آنچه بر لب چیده‌ای
صد ملل از ملتی انگیختی　　بر حصار خود شبیخون ریختی
یک شو و توحید را مشهود کن　　غائبش را از عمل موجود کن

لذت ایمان فزاید در عمل
مرده آن ایمان که ناید در عمل

«الله الصمد»

گر به الله الصمد دل بسته ای   از حد اسباب بیرون جسته ای

بندهٔ حق بندهٔ اسباب نیست   زندگانی گردش دولاب نیست

مسلم استی بی نیاز از غیر شو   اهل عالم را سراپا خیر شو

پیش منعم شکوهٔ گردون مکن   دست خویش از آستین بیرون مکن

چون علی در ساز با نان شعیر   گردن مرحب شکن خیبر بگیر

منت از اهل کرم بردن چرا   نشتر لا و نعم خوردن چرا

رزق خود را از کف دونان مگیر   یوسف استی خویش را ارزان مگیر

گرچه باشی مور هم بی بال و پر   حاجتی پیش سلیمانی مبر

راه دشوار است سامان کم بگیر   در جهان آزاد زی آزاد میر

سبحهٔ اقلل من الدنیا شمار   از تعش حرا شوی سرمایه دار

تا توانی کیمیا شو گل مشو   در جهان منعم شو و سائل مشو

ای شناسای مقام بوعلی   جرعه ای آرم ز جام بوعلی

پشت پا زن تخت کیکاوس را   سر بده از کف مده ناموس را

خود بخود گردد در میخانه باز   بر تهی پیمانگان بی نیاز

قاید اسلامیان هارون رشید — آنکه نقفور آب تیغ او چشید

گفت مالک را که ای مولای قوم — روشن از خاک درت سیمای قوم

ای نواپرداز گلزار حدیث — از تو خواهم درس اسرار حدیث

لعل تا کی پرده بندد در یمن — خیز و در دار الخلافت خیمه زن

ای خوشا تابانی روز عراق — ای خوشا حسن نظر سوز عراق

می‌چکد آب خضر از تاک او — مرهم زخم مسیحا خاک او

گفت مالک مصطفی را چاکرم — نیست جز سودای او اندر سرم

من که باشم بستهٔ فتراک او — برنخیزم از حریم پاک او

زنده از تقبیل خاک یثربم — خوشتر از روز عراق آمد شبم

عشق می‌گوید که فرمانم پذیر — پادشاهان را بخدمت هم مگیر

تو همی خواهی مرا آقا شوی — بندهٔ آزاد را مولا شوی

بهر تعلیم تو آیم بر درت — خادم ملت نگردد چاکرت

بهره‌ئی خواهی اگر از علم دین — در میان حلقهٔ درسم نشین

بی‌نیازی نازها دارد بسی — ناز او اندازها دارد بسی

بی‌نیازی رنگ حق پوشیدن است　　رنگ غیر از پیرهن شوییدن است

علم غیر آموختی اندوختی　　روی خویش از غازه‌اش افروختی

ارجمندی از شعارش می‌بری　　من ندانم تو تویی یا دیگری

از نمیش خاک تو خاموش گشت　　وز گل و ریحان تهی آغوش گشت

کشت خود از دست خود ویران مکن　　از سحابش گدیهٔ باران مکن

عقل تو زنجیری افکار غیر　　در گلوی تو نفس از تار غیر

بر زبانت گفتگوها مستعار　　در دل تو آرزوها مستعار

قمریانت را نواها خواسته　　سروهایت را قباها خواسته

باده می‌گیری بجام از دیگران　　جام هم گیری بوام از دیگران

آن نگاهش سر ما زاغ البصر　　سوی قوم خویش باز آید اگر

می‌شناسد شمع او پروانه را　　نیک داند خویش و هم بیگانه را

لست منی گویدت مولای ما

وای ما ای وای ما ای وای ما

زندگانی مثل انجم تا کجا　　هستی خود در سحر گم تا کجا

روزی از صبح دروغی خوردنی   رخت از پهنای گردون بردنی

آفتاب استی یکی در خود نگر   از نجوم دیگران تابی مخر

بر دل خود نقش غیر انداختی   خاک بردی کیمیا در باختی

تا کجا رخشی ز تاب دیگران   سر سبک ساز از شراب دیگران

تا کجا طوف چراغ محفلی   ز آتش خود سوز اگر داری دلی

چون نظر در پرده‌های خویش باش   می پروا تا بجای خویش باش

در جهان مثل حباب ای هوشمند   راه خلوت خانه بر اغیار بند

فرد فرد آمد که خود را وا شناخت   قوم قوم آمد که جز با خود نساخت

از پیام مصطفیٰ آگاه شو
فارغ از ارباب دون الله شو

«لم یلد و لم یولد»

قوم تو از رنگ و خون بالاتر است   قیمت یک اسودش صد احمر است

قطرهٔ آب وضوی قنبری   در بها برتر ز خون قیصری

فارغ از باب و ام و اعمام باش   همچو سلمان زادهٔ اسلام باش

نکته ئی ای همدم فرزانه بین
شهد را در خانه های لانه بین

قطره ئی از لالهٔ حمراستی
قطره ئی از نرگس شهلاستی

این نمی گوید که من از عبهرم
آن نمی گوید من از نیلوفرم

ملت ما شان ابراهیمی است
شهد ما ایمان ابراهیمی است

گر نسب را جزو ملت کرده ئی
رخنه در کار اخوت کرده ئی

در زمین ما نگیرد ریشه ات
هست نامسلم هنوز اندیشه ات

ابن مسعود آن چراغ افروز عشق
جسم و جان او سراپا نور عشق

سوخت از مرگ برادر سینه اش
آب گردید از گداز آئینه اش

گریه های خویش را پایان ندید
در غمش چون مادران شیون کشید

ای دریغا آن سبق خوان نیاز
یار من اندر دبستان نیاز

آه آن سرو سهی بالای من
در ره عشق نبی همپای من

حیف او محروم دربار نبی
چشم من روشن ز دیدار نبی

نیست از روم و عرب پیوند ما
نیست پابند نسب پیوند ما

دل به محبوب حجازی بسته‌ایم
زین جهت با یکدگر پیوسته‌ایم

رشتهٔ ما یک تولایش بس است
چشم ما را کیف صهبایش بس است

مستی او تا بخون ما دوید
کهنه را آتش زد و نو آفرید

عشق او سرمایهٔ جمعیت است
همچو خون اندر عروق ملت است

عشق در جان و نسب در پیکر است
رشتهٔ عشق از نسب محکم‌تر است

عشق ورزی از نسب باید گذشت
هم ز ایران و عرب باید گذشت

امت او مثل او نور حق است
هستی ما از وجودش مشتق است

«نور حق را کس نجوید زاد و بود
خلعت حق را چه حاجت تار و پود»

هر که پا در بند اقلیم و جد است
بی خبر از لم یلد لم یولد است

«و لم یکن له کفواً احد»

مسلم چشم از جهان بربسته چیست
فطرت این دل بحق پیوسته چیست

لاله‌ای کو بر سر کوهی دمید
گوشهٔ دامان گلچینی ندید

آتش او شعله ای گیرد به بر / از نفس های نخستین سحر

آسمان ز آغوش خود نگذاردش / کوکب وامانده ای پنداردش

بوسدش اول شعاع آفتاب

شبنم از چشمش بشوید گرد خواب

رشته ای با لم یکن باید قوی / تا تو در اقوام بی همتا شوی

آنکه ذاتش واحد است و لاشریک / بنده اش هم در نسازد با شریک

مؤمن بالای هر بالاتری / غیرت او برنتابد همسری

خرقهٔ لا تحزنوا اندر برش / انتم الاعلون تاجی بر سرش

می کشد بار دو عالم دوش او / بحر و بر پروردهٔ آغوش او

بر غو تندر مدام افکنده گوش / برق اگر ریزد همی گیرد بدوش

پیش باطل تیغ و پیش حق سپر / امر و نهی او عیار خیر و شر

در گره صد شعله دارد خنجرش / زندگی گیرد کمال از جوهرش

در فضای این جهان های و هو / نغمه پیدا نیست جز تکبیر او

عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم / هم به قهر اندر مزاج او کریم

سازِ او در بزم‌ها خاطرنواز	سوزِ او در رزم‌ها آهن‌گداز
در گلستان با عنادل هم‌صفیر	در بیابان جرّه‌ی بازِ صیدگیر
زیرِ گردون می‌نیاساید دلش	بر فلک گیرد قرار آب و گلش
طایرش منقار بر اختر زند	آن سوی این کهنه چنبر پر زند
تو به پروازی پری نگشوده‌ای	کرمکی استی زیرِ خاک آسوده‌ای
خوار از مهجوری قرآن شدی	شکوه‌سنجِ گردشِ دوران شدی
ای چو شبنم بر زمین افتنده‌ای	در بغل داری کتابِ زنده‌ای

تا کجا در خاک می‌گیری وطن
رخت بردار و سر گردون فکن